ہر شہر میں جنگل پھیل گیا
انوار فریدی

اہتمام اشاعت

محمد ابرار حنیف مُغل

نام کتاب : : : ہر شہر میں جنگل پھیل گیا
مصنف : : : انوار فریدی
اشاعتِ اول : : اکتوبر ۱۹۹۷ء
سرورق : : : رانا ریاض
کتابت : : : قمر یزدانی
قیمت : : : /- روپے
مطبع : : : این۔ بی پرنٹرز لاہور
ناشر : : : المدینہ پبلیکیشنز۔ لاہور

Marfat.com

اضطراب ہے۔ دہکتے سورج کے سائے سائے میں جب اپنے فنی سفر پہ نکلتا ہوں تو احساس کی دیواروں پہ جمی باتیں قطرہ قطرہ پگھل کر شاعری کا روپ دھارتی چلی جاتی ہیں۔ اداسیوں کے اُجاڑ رستوں پر کٹھن محرومیوں کے زرد پتے چُنتے ہوئے اِک ہجومِ بیکراں کے اس منظر نامے میں میری بصارتوں کے لیے کوئی پُرسہ نہیں۔ میری سماعتیں اجاڑ آنکھوں کے ویران روزنوں کے اُس طرف ستارے پھانکتی اندھی ہواؤں کے شور کی زد میں ہیں۔ یہ دہکتی ہوئی گلیوں میں تیزی سے اترتا ہُوا زہریلی باس کا مُہلک جادو۔ شفاف تمناؤں کے ریشم میں لپٹے خوابوں کے سسکیاں لیتے اور بجھے بجھے جاں بہ لب جگنو، رگِ جاں میں تیزاب کی صورت مرگِ صدا کے اُترتے ہوئے بے کنار سنّاٹے، خوشبوؤں کو زخم دیتی خنجر بکف اور زہر آلود ہوائیں، سہمی سہمی اداس شاموں کے احوال پہ ماتم کرتی بے نور صبحیں، اُجڑی اُجڑی ویران صبحوں کے اضطراب کی بے رنگ ہتھیلیوں پر نوحے لکھتی بے رُوح شامیں، مقتلوں کے میلے میں رقص کرتے ہوئے جبر و استبداد کی خونی جھنکار، جسموں سے لمحہ لمحہ لہو نچوڑتے ہوئے روگ، پلکوں کی بھیگی بھیگی جھالروں کے اُس پار آگ پیتی اور شرارے اگلتی سوچیں، شہر شہر جنازوں میں ڈھلتی ہوئی گل بکف تمناؤں کی سیج، چہرہ چہرہ شادابیوں کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہوئی درد کی راکھ، قدم قدم سازشوں اور منافقتوں کے عذاب، شہ رگوں میں محرومیوں کے ٹوٹتے ہوئے نشتر، قتل گاہوں کا رُوپ دھارتے ہوئے چوراہے اور بازار، بستیوں کے چار جانب کراہتی خواہشوں، جاگتے زخموں، ہانپتے سانسوں، بھڑکتے شعلوں، ٹوٹتے خوابوں، بدلتے رنگوں، سُلگتی آنکھوں، بھیگتی پلکوں، اُجڑتی نیندوں، تڑپتی آسوں، چیختی ہچکیوں، ڈوبتی نبضوں، دہکتی سوچوں اور

اِنتساب

لوح و قلم اور حرف و صوت کے خالق اپنے پیارے

اللہ رَبُّ العزّت کے نام !

جس نے مجھے انسانیت کے جذبوں، کراہوں اور

آنسوؤں کو زبان دے کر صفحۂ قرطاس پر سجانے کا

ہنر اور توفیق عطا کی !

شکریہ میرے مولا جانی! شکریہ !

میرے جسم کا رواں رواں سجدۂ شکر بجا لاتے

ہوئے تیرے حضور سپاس گزار ہے !

انوار فریدی

بکھرتی چیخوں کے سلسلہ دَر سلسلہ پھیلتے ہوئے سنگین دائرے۔ بے جہت راستوں کی جگر سوز تھکن کے کوہِ گراں تلے دبے نیم مُردہ انسانی ڈھانچے، حنا کے نُور سے محروم ہتھیلیاں، گلستانوں کی حفاظت پر مسلّط آتش فشانیاں، آتے جاتے گونگے بہرے لمحوں کی ڈور سے بندھی ہوئی تنہائیاں، بجھتی آنکھوں کے بوسیدہ فانوسوں کو کرن کرن چاٹتے ہوئے شب تاب اندھیرے، محبّتوں اور چاہتوں کے عوض سینوں میں گڑتے اور بے حمیتی کی ہواؤں میں لہراتے ذِلتوں کے پرچم۔ روشنی کو ترستے ہوئے تاریک دریچوں سے اترتی ہوئی مُنہ زور وحشتیں اور دھڑکنوں کے اکھڑے ہوئے خیموں میں ہچکیاں بُنتی اداس زندگی۔ میری شاعری انہی آتش بکف اور رُوح فرسا منظروں میں احساس کے جلنے، تڑپنے، سُلگنے اور پگھلنے کے دِل خراش اور اذیت ناک عمل سے عبارت ہے۔

میرا فن اپنے عصری تقاضوں سے اغماض اور بے نیازی کے جرم کا مُرتکب ہوا ہے نہ ہوگا۔ میری شاعری اپنے عہد کی شکست و ریخت کی آواز اور کرب کی دُھوپ میں لپٹی ہچکیوں کا ایک سفرنامہ ہے۔

اس مجموعۂ کلام کا انداز، اسلوب اور مزاج "نوائے انقلاب" یا "پگھل جائیں گی زنجیریں" سے مختلف ہے۔ اس میں ظاہراً آپ کو انقلابی للکار یا یلغار کی کوئی گھن گرج سُنائی نہیں دے گی۔ اگر شعلوں کی طرح لہراتی اور بجلیوں کی طرح لپکتی انقلابی صدائیں ایک جذبہ ہیں تو انسانی دکھوں کی خالی ہتھیلیوں پر دھرے ہوئے آنسوؤں کے چراغ بھی تو ایک جذبہ ہیں۔ ہر آواز، ہر جذبہ اور ہر احتجاج بھی تو لفظوں کے سانچے میں نہیں ڈھلتا، کچھ آوازیں، کچھ جذبے اور کچھ احتجاج آنسوؤں کا رُوپ دھار کے خاموشی کی زبان بھی تو بولتے ہیں

نہ پوچھ کیسے دیے بجھاتی ہوئی ہوا سے
بچا کے رکھا ہوا ہے تیرا خیال میں نے

Marfat.com

ہر شہر میں جنگل پھیل گیا

انوار فریدی

المدینہ پبلیکیشنز
4۔ یوسف مارکیٹ ○ غزنی سٹریٹ ○ 38۔ اردو بازار۔ لاہور ○ فون: 7320682

ترتیب

Marfat.com

ث

درد کے رازوں سے آشنا ایک مختلف شاعر

انوار فریدی اُن نوجوانوں میں سے ہے جن کے لیے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا۔

ع جوانوں کو پیروں کا استاد کر

اس دھکتے ہوئے دل والے نوجوان نے جوانی کا راز پالیا ہے اور وہ سب کچھ کرنے پر تُل گیا ہے۔ جس کی آرزو ڈھلتی ہوئی عمر میں ایک بُجھی ہوئی حسرت بن جائے۔ اس نے خوبصورت اور ولولہ انگیز شاعری کی ہے اور صرف شاعری ہی نہیں کی بلکہ اپنے عزائم اور ارادوں کی تکمیل کے لیے پیہم جدوجہد میں بھی مصروفِ عمل ہے۔ اس نے اپنے عمل اور ردعمل کو ہم رنگ کیا، اپنے غم اور غصے کو ہمراز بنایا اور ہر لمحے کی آنکھ میں وہ منظر رکھ دیا جو وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ جو وہ دیکھنا چاہتا ہے وہ دکھانا بھی چاہتا ہے۔ اس نے نعت لکھی، غزل لکھی، نظم لکھی اور اظہار کے ان سارے منطقوں کی سرحدیں ملا دیں۔

اس کا پہلا (نعتیہ) مجموعۂ کلام "انوارِ عقیدت" پھوار بن کر لہو میں اس طرح گرتا ہے جس طرح شبنم پھولوں کی پتّیوں پہ گرتی ہے۔ اس کی انقلابی نظموں میں بھی شاعری زور کرتی ہے۔ اس کی ایک کتاب کا نام ہی "نوائے انقلاب" ہے۔ نوائے انقلاب اس کی خوشنوائی کا ایک بھرپور اظہار ہے۔ وہ جانتا ہے کہ خوشنوائی اور ہم نوائی ایک ہی چیز ہوتی ہے اور پھر اس کا ایک اور مجموعۂ کلام "پگھل جائیں گی زنجیریں" بھی بھرپور انقلابی جھنکار لئے ہوئے ہے۔ سو جب میں نے "پگھل جائیں گی زنجیریں" کو پڑھا تو محسوس

ہوا کہ انوار کا اضطراب کہیں کہیں حیرانی میں بھی ڈھل جاتا ہے کہ زنجیریں پگھلتی تو ہیں مگر پھر زنجیریں بن جاتی ہیں اور پھر وہ سوچتا ہے کہ رقص تو زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے۔ وہ میری طرح اُن لوگوں میں سے ہے جو وجد اور رقص میں کوئی دُوری نہیں پاتے۔ اس کے نزدیک شیشہ آنکھیں اور پتھر ہاتھ ایک ہی کردار رکھتے ہیں۔ اس نے اپنے ایک شعری مجموعے کا نام ہی "شیشہ آنکھیں پتھر ہاتھ" رکھ دیا۔ میں نے کہیں ایک شعر دیکھا تھا۔

شیشہ ٹوٹے غُل مچ جائے
دِل ٹوٹے آواز نہ آئے

بس یہ ہوا کہ انوار نے دل کے ٹوٹنے کی آواز سُن لی۔ اب وہ چاہتا ہے کہ یہ آواز دوسرے بھی سُن لیں اور اس کے لیے اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں کہ آدمی شاعری کرے اور اچھی شاعری کرے۔ دِلوں سے دلوں تک کی مسافت اسی دروازے سے ہو کر ہی طے کی جا سکتی ہے۔

اسی آواز کے ساتھ چلتے چلتے اسے وہ سمندر دکھائی دیا جسے اُس نے "پلکوں پار سمندر" کا نام دیا۔

میں انوار کی شاعری کی سرشاری میں کہیں اُس پار چلا گیا ہوں جب کہ میرے سامنے اُس کے تازہ مجموعۂ کلام "ہر شہر میں جنگل پھیل گیا" کا مسوّدہ رکھا ہوا ہے۔ اب تو واقعی ہر شہر میں جنگل پھیل گیا ہے۔

ایک محاورہ جنگل میں منگل کا بھی ہوتا ہے مگر اس کی کوئی جھلک انوار کی شاعری میں دکھائی نہیں دی۔ وہ بالکل اور طرح کا نوجوان ہے۔ اب تو یہ بات میری حسرتوں میں شامل ہو گئی ہے کہ کاش میں بھی اپنی جوانی میں اس طرح کے کسی احساس کو اپنے وجود میں کوئی راہ دے سکتا۔ انوار فریدی زندگی سے تو کوئی

کام لینا چاہتا ہی ہے اور وہ کام کوئی ایسا ڈھکا چھپا نہیں، وہ شاعری سے بھی کسی حد تک یہ کام لینا چاہتا ہے مگر ان دو کاموں میں اتنا فرق ہے کہ اس کی وضاحت کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ جب دو دریاؤں کا سنگم ہوتا ہے تو دُور تک اُن کے پانی آپس میں ملتے دکھائی نہیں دیتے اور جب ملتے ہیں تو گھُل مل جاتے ہیں۔

انوآر اس دریا میں تیرنا چاہتا ہے جو اس کے اندر بہہ رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب یہ دریا دوسرے لوگوں کے اندر بھی بہنے لگے گا تو پھر ہم سب وہ منظر دیکھیں گے جو انوار نے دیکھا، مگر ابھی اس طرح نہیں دیکھا، جس طرح وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ بس اسی خواہش نے اُسے مست بلکہ سرمست کر رکھا ہے۔

میں نے کہیں یہ کہا تھا کہ زمین اور چیز ہوتی ہے اور سرزمین اور چیز۔ انوآر ان دونوں جگہوں کا باشندہ ہے۔ وہ نہ تو وہ جگہ چھوڑنا چاہتا ہے۔ جہاں اس کا ضمیر و خمیر تیار ہوا، اور وہاں رہنے کی آرزو بھی اُسے ستاتی ہے جہاں ایک ایسی جنت موجود ہے کہ جو اب تک صرف آرزوؤں میں تڑپتی ہے۔ اور یہی تڑپ انوآر کی شاعری کا راز ہے۔

میں یہ بات پورے وثوق اور وفور سے کہہ رہا ہوں کہ انوآر ایک ایسا شاعر ہے۔ جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔ منتظر دنیائیں اُس کے ساتھ ہیں۔ اور لوگ اُس کے لیے وہاں کھڑے ہیں جہاں شہر جنگل کے ساتھ مل رہا ہے۔ یہ شہر اور طرح کا ہے اور وہ جنگل بھی اور طرح کا ہے۔ جس کی طرف انوآر نے اشارہ کیا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں لوگ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ وہ جنگل کا رُخ کریں یا شہر کا مگر انوآر نے شہر میں جنگل پھیلنے کی خبر سنا کر یہ اُلجھن بھی ختم کر دی ہے۔

انوار اس عمر میں بھی ایک دلِ دردمند رکھنے والا انسان ہے۔ اور جوانی میں یہ حقیقت کچھ اور رنگ لاتی ہے، کئی اور لوگوں کے پاس بھی یہ رنگ ہیں، مگر وہ رنگ کچے ہیں۔ پکے رنگوں کی بہار دیکھنا ہو تو انوار سے ملو، اس کی شاعری پڑھو۔ وہ ایک مختلف شاعر ہے اور مختلف شاعر ہونے سے بڑی صفت کوئی اور نہیں ہوتی اور یہ صفت انوار کو حاصل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب انوار کی شاعری دل سے پڑھی جائے گی تو لوگ یہ ماننے پر مجبور ہو جائیں گے۔ کہ یہ شخص کسی اور دُنیا سے آیا ہے اور دُنیا کو کوئی اور دُنیا بنا دینا چاہتا ہے۔ ایسے ہی لوگ زندگی کے اندر ایک اور زندگی کی تلاش میں رہتے ہیں۔

انوار کے لیے زندگی اور شاعری یکجان ہو چکی ہیں اور اسی عمل نے اسے یکتا کر دیا ہے۔ سنجیدگی اور شائستگی مل کر ایک ایسی شگفتگی تیار کرتی ہیں جو آج لوگوں کو میسّر نہیں۔ انوار جیسے نوجوان شاعر ہماری غریب قوم کیلئے غنیمت ہیں۔ مجھے یہ بھی ڈر نہیں کہ لوگ اُسے مالِ غنیمت سمجھ لیں گے۔ یہ وہ مالِ غنیمت ہے جو فاتح کے ساتھ ساتھ شکست کھائی ہوئی قوم کو بھی ملتا ہے اور پھر شکست فتح میں بھی بدلتی ہے۔ اور انوار کی شاعری اس لمحے سے پھوٹتی ہے جسے فتح مند لمحہ کہا جا سکتا ہے۔

انوار فطری طور پر شاعر ہے اور ملال انسانی فطرت کی بنیاد میں پیوست ہوتا ہے۔ میرے نزدیک دَرد ایک راز ہے اور لوگ رازوں سے آشنا ہونا نہیں چاہتے۔ جس نے اس راز کو پا لیا وہ اس طرح کی شاعری کرنے لگ گیا جو انوار کرتا ہے۔

دَرد کبھی ردّ عمل بنتا ہے اور پھر اس دَرد کے اندر بغاوت کی کیفیت نمودار ہوتی ہے۔ شاعر باغی نہیں ہوتا مگر لوگ اُسے باغی بنا دیتے ہیں۔ کبھی کسی سچّے شاعر

نے بغاوت کو سیاست نہیں بننے دیا اور نہ سیاست کا شکار ہونے دیا ہے۔ وہ بغاوت کو بھی فطرت سمجھتا ہے اور جب چیزیں فطرت کے قریب رہتی ہیں تو وہ اپنی اصل سے دُور نہیں ہوتیں۔ شاعر اسی اصل سے وصل چاہتا ہے۔ مگر پورا وصل ممکن نہیں۔

اضطراب اور انقلاب میں کتنا فاصلہ ہے؟ شاعر انقلاب لانا چاہتا ہے یا نہیں لیکن وہ اضطراب ضرور لانا چاہتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ انوآر ایک مضطرب روح لے کر پیدا ہوا ہے اور وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ زندہ لوگ بے رُوح نہ ہو جائیں۔ جب وہ لوگوں کو بے روح ہوتا دیکھتا ہے تو پھر تڑپتا ہے اور اپنے تڑپنے کی تصویریں اپنی آنکھوں میں رکھ لیتا ہے۔ جنہیں لفظ دیکھتے ہیں، جس طرح دیکھنے کا حق ہوتا ہے۔

انوآر کی شاعری میں وہ شاعری ذرا کم ہے جو نئے نویلے نوجوانوں کا شیوہ ہوتا ہے۔ میں نے کہا ناں کہ وہ اور ہی طرح کا نوجوان ہے۔ نہ جانے الطاف حسین حالی نے کن نوجوانوں کے لیے کہا تھا کہ

ع کچھ کر لو نوجوانو! اُٹھتی جوانیاں ہیں

مجھے یقین ہے کہ حالی کا مخاطب انوآر نہیں تھا۔ وہ تو آپ اپنا مخاطب ہے۔ اُس کی شاعری میں زمانے بھر کے کرب ہجوم کرتے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ قرب بھی ایک کرب ہے۔ مگر دُوریاں بھی اُسے گھیرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔

میں انوآر کی شاعری کو پڑھتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ اس نے اُن کیفیتوں کو بھی محسوس کیا جو صرف میری کیفیتیں ہیں۔ میں مایوسیوں کی دہلیز پہ کھڑا ہوں اور ابھی تک باہر یا اندر جانے کی کسی آرزو کو رہنما نہیں بنا سکا۔

یہی آرزو انوار کی شاعری میں راہ بنتی دکھائی دیتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ابھی اور لکھے گا اور بہت لکھے گا۔ مگر یہ کب ہوگا کہ جو باتیں ہم کاغذ پہ لکھتے ہیں وہ دِلوں میں بھی لکھی جائیں۔ انوار کی شاعری ایسی ہے جو دِلوں پر لکھے جانے کے قابل ہے وہ اپنی قوتِ بیان سے یہ معرکہ بھی کر دکھائے گا کہ دل اس کی آواز سُن کر کسی اور طرح دھڑکنا شروع کر دیں۔ مجھے بہت پہلے کا سُنا ہُوا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

؎ تم بھی مری طرح کبھی مشکل میں آئے تھے
گھبرا کے دو جہاں سے مرے دِل میں آئے تھے

پروفیسر ڈاکٹر محمد اجمل نیازی
لاہور۔

—————:o:—————

سپنوں کی شال اوڑھے جاگتی آنکھیں

اس سخن دشمن زمانے میں جہاں کذب و کم مائیگی کا راج ہے ـــ انوار فریدی صاحب نے مجھے اپنے نئے شعری مجموعے کا دیباچہ لکھنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔

اس ماحول میں جہاں دراز سخن اور تنک مایہ لوگ قلم قبیلہ کے سرخیل اور پردھان ہیں وہاں شاعری کے علاوہ کوئی بات باعثِ گردن زنی بھی ہوسکتی ہے کیونکہ شاعری میں تو ایجاز و اختصار، تلمیح و استعارہ، رمز و ایمار اور تفویف و ابہام کی صورت میں فصاحت و بلاغت کے کئی امکانات ہیں جو ان کوتاہ سخنوں کی دسترس سے باہر ہیں اور انہیں ملول رکھتے ہیں جبکہ ہمارے لئے تخلیقی حظ کا سبب بنتے ہیں۔ ہم اس زمانے کے لیئے بھی اور آئندہ زمانوں کے لئے بھی اپنا نقشِ سخن ثبت کر جاتے ہیں اور حصول زر و منصب میں مبتلا ان ادبی بہر دپیوں کے مال پر مسکرا بھی لیتے ہیں۔ انوار فریدی بھی ہمارے قبیلے کا آدمی ہے۔ پرجوش، زود گو، مصلحت ناآشنا اور اپنے ایک ایک لمحے کا حساب رکھنے والا، شاید یہی سبب ہے کہ اتنی کم عمری میں اس نے بہت زیادہ لکھ لیا۔

کارزارِ سخن میں ابھی وقوف کا لمحہ نہیں آیا کہ جہاں بیٹھ کر انسان اپنے سود و

زیاں کا شمار کرتا ہے۔ تجربوں اور مشاہدوں سے بھرپور جوانی کے ایام کسی بھی سخنور سے ایسی ہی بھرپور تخلیقی سرگرمی کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس تگ و دو میں "کیا کھویا کیا پایا" شاعر کا نہیں زمانے کا منصب ہے، کہ جائزہ لے، انوار فریدی بھی چڑھتی ہوئی موجوں پر کمندیں پھینک رہا ہے۔

اور ؎

برائے شعرِ تازہ رات دن اِک بے قراری چاہتا ہے
زمامِ عصر تھامے اسپِ تازی کی سواری چاہتا ہے

ہمارے عہدِ نامعتبر نے رویّوں، قدروں اور لفظوں کا اعتبار ختم کر دیا ہے۔ شعری اوصاف و محاسن معائب میں ڈھل چکے، نئے رویّے اور نئی قدریں ابھی بے جہت اور بے معنیٰ ہیں، صوت پر تصویر کو فوقیت حاصل ہے۔ سیرت کی بجائے صُورت کو دیکھا جاتا ہے اور اقدار کی بجائے مقدار پیشِ نظر رہتی ہے، لہجوں میں نرمی نہیں، معانقوں میں گرمی نہیں اور سب کچھ ایک تواتر اور تسلسل سے ہوتا رہتا ہے، مِلنا ملانا، اُٹھنا بیٹھنا ایک رسم نبھانے کی طرح ہے، یہ ہے عہدِ جدید کا مشینی انسان، بے حس، تھکا ہوا، مضطرب، زخمی خُور و خواب سے محرُوم، خیر و خُوبی سے دور اور مجبُورِ محض ــــــ انوار فریدی کے اس مجموعۂ کلام کا نام "ہر شہر میں جنگل پھیل گیا"، اِنہی تلخ حقائق کے اظہار کا بھرپُور استعارہ ہے۔ یہ بڑا بلیغ اور وسیع المعانی نام ہے۔

تاریخی حوالے سے دیکھا جائے تو صرف کچھ صدیاں پہلے یہ ساری زمین جنگل ہی تو تھی، زمین اور اس کے تمام تر وسائل کے عوام ہی مالک تھے،

اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کے مطابق اسے جو شکل چاہتے دے لیتے پھر آبادی بڑھی، سائنس نے ترقی کی اور اس زرعی زمین پر بڑے بڑے صنعتی شہر بننے لگے، اندازِ حکمرانی بدلے، افراد اور اقوام میں وسائل پر قبضے کی جنگ تیز ہونے لگی، شہر مقتل بنتے گئے، فضاؤں کو دھوئیں اور شور کی چادر نے لپیٹ لیا، سُریلی آوازوں اور خوبصورت پروں والے پرندے ہجرت کر گئے، مگر انوار فریدی کا استعارہ، یہ جنگل، اس میں کون رہتا ہے؟ اینٹوں اور سیمنٹ سے بنے ہوئے پلازے اور دل، پتھریلی سڑکیں اور ان پر خون آلود گرد، ویگنوں اور بسوں پر سوار ہونے کی ناکام تگ و دو میں عمریں بتاتے عوام اور ان پر دھول اڑاتی ایئر کنڈیشنڈ گاڑیوں میں سوار معزز سمگلر اور ڈاکو صاحبان دولت سے بھرے بنک اور خالی پیٹ مخلوقِ خدا، راشی افسر اور کام چور کارندے، اور یوں آہستہ آہستہ "ہر شہر میں جنگل پھیل گیا"۔

یوں تو جنگل میں کچھ خوبصورتیاں بھی ہوتی ہیں، فطرت کا حُسن، تر و تازہ ہوائیں، پرندوں کے نغموں سے لبریز فضائیں، خنک اور شاداں مہکتے سائے مگر جس جنگل کی بات انوار فریدی نے کی ہے وہ بنجر بن، خون خواری اور درندگی کا ایک بلیغ استعارہ ہے، جہاں طاقت ہی قانون کا درجہ اختیار کر چکی ہے اور یوں تمام تر ارتقا اور تہذیب و تمدن کی جانب انسانی دانش کا سفر ایک بار پھر رائیگاں ہو جاتا ہے اور کوئی دلیل و منطق، مذہب و اخلاقیات، علم و ادب، عدل و انصاف، اصول و ضابطہ، فقہ و قانونِ انسان

کی بے مہار طاقت کے ہاتھوں رُوبعمل نہیں رہتے اور جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کا سا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔

انوار فریدی جیسے ایک سرگرم اور پُرجوش نوجوان نے شاعری ایک جذبۂ جہاد کے تحت کی ہے، اس کے لہجہ میں عزم اور حوصلے کی گھن گرج تو ہے ہی ایک اُمنگ بھی ہے۔ ایک آرزو بھی ہے جو التجا نہیں بن سکی پر کہیں کہیں دُعا ضرور بن گئی ہے۔ وہ کھُلی آنکھوں سے دُنیا کو دیکھتا ہے تو کریہہ المنظر ماحول سے بیزار ہو جاتا ہے، پھر وہ اپنی جاگتی آنکھوں پہ رنگین سپنوں کی شال اوڑھ لیتا ہے اور اپنے لیئے ایک دھنک تخلیق کرتا ہے جو خیال ہی سہی لیکن اس کے خوابوں سے ہم آہنگ ضرور ہے، خواب روشنی کے، خواب پھولوں کے خواب خوشبو کے اور خواب منزّہ زندگی کے جو ہم سب کے مشترکہ خواب ہیں جو بنی نوع انسان کے خواب ہیں۔

انوار فریدی اپنے زمانے کا ہم سفر ہے اور شاعری اُس کی زندگی کا سفرنامہ، آئیے اس سفر کی داستان خود اُس سے سُنتے ہیں، ؎

کم نگاہوں میں اُجالے بانٹنے کا ہے صلہ
آج ہاتھوں میں چراغوں کی بجائے زخم ہے

غم کی برسات میں زندگی کٹ گئی
یوُں ہی صدمات میں زندگی کٹ گئی

ہم کو ڈستے رہے جن کے دیوار و در
اُن مکانات میں زندگی کٹ گئی

در کھلنے کا عکس نظر میں رہتا ہے
سوچیں گھر میں، جسم سفر میں رہتا ہے

جو چور بانٹتا ہے زر گرفت کے ڈر سے
ہجومِ شہر اُسے بھی سخی سمجھتا ہے
میں اس کے تاج کو پاؤں میں روند سکتا ہوں
جو مفلسی کو مری بے بسی سمجھتا ہے
ڈرا رہا ہے خدا کے عذاب سے واعظ
مگر کچھ ایسے کہ خود کو بری سمجھتا ہے

آنکھیں جل تھل کر دیتی ہیں
سوچیں پاگل کر دیتی ہیں
ہونٹوں کی خاموش فضائیں
گھر کو جنگل کر دیتی ہیں

ارمانوں کی بانجھ ہوائیں
دل کو مقتل کر دیتی ہیں

چمکا ایک ہی نام دُعا کے ماتھے پر
کیا کرتا میں اور سوال جُدائی میں
اُبھرے آہٹ جیسے تیرے قدموں کی
ٹِک ٹِک بجتا ہے گھڑیال جُدائی میں
جاگتی ہیں انوار مرے سنگ آنکھیں بھی
سپنوں کی اِک اوڑھ کے شال جُدائی میں

شاعری میرے خیال میں زندگی کو خوبصورت رکھنے کا ایک فطری عمل ہے جس طرح ایک پھول اپنی خوشبو سے فضا کو معطر رکھنے کا باعث بنتا ہے اسی طرح ایک اچھا شعر زندگی کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ شاعر کا منصب بھی یہی ہے کہ وہ زمانے سے کچھ نہیں لیتا سوائے دُکھوں کے اور ان دُکھوں سے وہ زمانے کے لیئے امرت بناتا ہے اور زندگی کی خوبصورتی کے عمل میں معاون ہوتا ہے۔

انوار فریدی کا اسلوب بیان بالکل نئے نویلے' تازہ دم اور نووارد شاعر کا ہے اور اس کے ساتھ ایک بنیادی خصوصیت جو اُن کی شاعری میں ہے وہ ایک متصوفانہ طرزِ احساس ہے جو کہ نظموں کے ساتھ ساتھ

غزل کے اشعار میں بھی ہمیں نظر آتا ہے' اس کے علاوہ اُن کا بھرپور خطیبانہ انداز بھی ہمیں اُن کی شاعری میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

شاعر چونکہ بہت حسّاس ہوتا ہے اور وہ اپنے عہد کی سچائیوں سے علیحدہ نہیں رہ سکتا اس لیے انوار فریدی بھی اپنے عہد کی سچائیوں کو پُوری طرح محسوس کرتے ہیں' وہ اپنے اشعار میں جس جُرأت' جاں سپاری اور ہمّت کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کرتے اور جس طرح تمام تر کلاسیکی شعری روایت اور محاسن اور زبان و قواعد کے اکتسابی تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے خیالات کو اشعار میں ڈھالتے ہیں تو اس سے بجا طور پہ یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ جوں جوں ان کے اس خوبصورت رنگ میں پختگی آتی جائے گی اُن کا یہ اسلوب ایک نمائندہ حیثیت اختیار کرتا چلا جائے گا۔

وہ بُنیادی طور پہ غزل گو ہیں اور غزل ہر عہد کی صنفِ سخن ہے بلکہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا غزل معتبر اور باوقار ہوتی جائے گی' تمام تر شعری لوازمات اور خوبصورتیوں سے ہم آہنگ غزل کا ایک شعر کئی نظموں پہ بھاری ہو جاتا ہے۔ غزل آج ہی کی نہیں مستقبل کی بھی صنفِ سخن ہے۔ انوار فریدی کی غزل ہمارے عہد کی غزل ہے' میرے لیے اس مجموعۂ کلام کو پڑھنا یوں تھا جیسے میں اپنے عہد کو پڑھ رہا ہوں۔

آئیے آپ بھی میرے ساتھ اپنے عہد سے ہم کلام ہوں۔

ستّار سیّد لاہور

ہمہ جہت شخصیت ہمہ جہت فنکار

اگر شعر کے حوالے سے بات شروع کی جائے تو اس سے ہمارا رشتہ بہت پرانا نکلتا ہے اور پھر ہمارے وطن عزیز کا خواب بھی تو ایک شاعر ہی نے دیکھا تھا۔

ع ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

کا ہمارے اندر نسل در نسل یہ پیغام بھی اسی شاعر مشرق ؒ ہی کی نوک قلم کا مرہون منت ہے۔ قلم علامتِ زندگی ہے اور شاعری شیوہ پیغمبری مجھے اس بحث میں نہیں پڑنا کہ شعر کیا ہے اور شاعر کیسے بنتا ہے مجھے تو اتنا علم ہے کہ جب شاعر فکر آموز ہو۔ قدرت نے اُسے عَلَّمَہُ البیان سے بھی نواز رکھا ہو وہ سفر کو وسیلہ ظفر جان کر اپنے اعلےٰ مقاصد کے ساتھ قریہ قریہ رواں دواں بھی ہو اور پھر احساس کا نور لیے اپنی دھن میں مگن شعر کو تیر اور قلم کو کمان جیسے ہتھیار کا نعم البدل جان کر استعمال کر رہا ہو تو ایسے میں ''انوارِ عقیدت'' ''نوائے انقلاب''. ''شیشہ آنکھیں پتھر ہاتھ''۔ ''پگھل جائیں گی زنجیریں'' اور ''ہر شہر میں جنگل پھیل گیا'' وغیرہ جیسی کُتب کا تخلیق ہو جانا ایک عین فطری امر ہے۔

انوار فریدی سے میرا پہلا تعارف کویت میں ''پگھل جائیں گی زنجیریں'' اور اس کی تقریبِ رونمائی کی وساطت سے ہوا۔ مَیں نے اپنی صائب رائے

صاحبِ کتاب کے بارے میں اسی وقت قائم کر لی تھی۔ اب "ہر شہر میں جنگل پھیل گیا" کے مسوّدے نے میری حتمی رائے کو بار دگر صفحہ قرطاس پر سجا دیا ہے۔ کتاب نہ صرف شاعر کا تعارف ہوتی ہے بلکہ گھومتے آئینے (REVOLVING MIRROR) کی طرح نگری نگری تہذیبی ورثوں کی جھلکیاں بھی تبرّکاً بانٹتی پھرتی ہے۔

علم کے لیے بزرگی کی کوئی شرط نہیں اور بزرگی کے لیے وراثت ضروری نہیں۔ انوار فریدی کے علمی حوالوں کی تصویر کشی کے لیے ایک علیحدہ کینوس درکار ہے اور اسکی خدمات کے لیے اس سے بھی وسیع تر۔ وہ جس کی عمر انگلیوں کی پوروں پہ گنی جا سکتی ہے۔ بجھتی آنکھوں میں اُمید کی جوت جلانے کا فریضہ بطریقِ احسن ادا کر رہا ہے ہماری دلی دعائیں اس کے ساتھ ہیں اور اگر وہ ایسا نہ کرتا تو خدائے وحدہٗ لاشریک کے ہاں جوابدہ ہوتا۔

اس جواں سال منجھے ہوئے صاحبِ کلام اور شعلہ بیان مقرر کو کون نہیں جانتا۔ اس کا بولنا اور اس کا لکھنا دونوں میزان کے دو ایسے پلڑے ہیں جو ایک دوسرے پر بھاری ہیں جسے صرف بولنا اور لکھنا ہی نہیں بلکہ کہنا اور سننا بھی آتا ہے۔ وہ ادب برائے ادب نہیں، ادب برائے زندگی اور زندگی برائے مقصدیت کا قائل ہے اور صرف قائل ہی نہیں بلکہ عامل بھی ہے وہ اپنی ہمہ جہت شخصیت کے ساتھ عظیم تر مقاصد کے لیے عظیم تر منزل کی طرف گامزن ہے۔

انوار فریدی نے اپنے اندر کے فطری شاعر کو نہ صرف دریافت کیا ہے

بلکہ اُسے پال پوس کر سدا بہار بھی رکھا ہے۔ ایک فطری شاعر ہونے کی بنا پر وہ ہر منظر کو احساس کی آنکھوں سے دیکھتا ہے تو تتلیوں کے بدن کا عنوت خود بخود دپلکوں کی تراوت میں بھیگ کر ہر خلیۂ چشم سے رگ جاں میں چپ چاپ در آتا ہے اور یہی واردات قلبی فنِ لطیف کا نقطۂ آغاز کہلاتی ہے۔ کسی واردات کے بغیر حروف لے گوہر سیپیوں کی طرح مُنہ اُٹھائے قلمدان کی سمت دیکھتے چلے جاتے ہیں اور جب یہ وارداتی لمحے قربۂ جاں میں اُترتے ہیں تو سوچوں کی بھول بتیاں زندگی کی تلاش میں نرم و ملائم کرنوں کو جیکے چپکے دل کی بند مٹھی میں کوئی جیتی جاگتی کہانی تھمانے کی انتھک جدوجہد میں جت جاتی ہیں۔ بادلوں کے ٹکڑے ننھے منے بچوں کی طرح بوچھاریں تحفے میں لاتے ہیں۔ گردش کی گرد اپنے آپ بیٹھتی چلی جاتی ہے ہوائیں مجسم دکھائی دینے لگتی ہیں۔ خوشبوؤں کا لمس انگلی تھام کر چلنے کی کوشش کرتا ہے تجسس ہاتھ میں دیا لے کر منزلوں کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔ کبھی اس واردات قلبی کا فیضان یوں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

○ ۔ چراغ، سورج، کرن، ستارا
غزل میں سارے خطاب تیرے

○ راحت، بہار، چاندنی، خوشبو، دھنک، صبا
یکجا کریں جو سب کو تو بنتا ہے تیرا نام!

اور کبھی چاہت کی کلیوں کو سیراب کرنے کے لیے رگ جاں سے ان دیکھے سوتے پھوٹ نکلتے ہیں۔ گرم ہوا بھی چھو لے تو پھولوں کی چیخیں تک سنائی

دیتی ہیں۔ یادوں کا زہر امرت اور آنسو آبِ حیات بن جاتے ہیں۔

برسا رہا ہے روح پہ رنگوں کی بارشیں
دھرتی سے آسمان تک پھیلا ہے تیرا نام

ذہنی پاکیزگی کلام کا جزوِ اعظم ہے کیونکہ طہارت ادب کا تقاضا ہے۔

شاید لبوں کا لمس ادب سے تھا ماورای
پلکیں ملا کے دُور سے چوما ہے تیرا نام

دراصل فنکار وقت کی سُر تال سے جو کچھ سیکھتا ہے اس کے لحن و لہجے میں دل کے اِکتارے اور زبان سے سود سمیت معاشرے کو لوٹا دیتا ہے انترے اور استھائیاں تخلیق کرنے کا فن مفت میں ہاتھ آجاتا ہے۔

کسی کے چہرے کی گردِ دھونے کی آرزو اور جستجو میں
غبارِ غم بن کے اسکی راہوں میں خود ہی کوئی بکھر چکا ہے

یہاں شاعر انفرادیت اور اجتماعیت کے دوراہے پر ستانے سوچنے اور فیصلہ کن اقدام کے لیے رک سا گیا ہے۔

میں آگ پہنوں، تو لہر اوڑھے
یہ دشت میرے، چناب تیرے
کچھ ایسے دُکھ سُکھ کو بانٹ لیں، آ
عذاب میرے، گلاب تیرے

شاعر نے لقائی ہوش و حواس انفرادیت کو اجتماعیت پر قربان کرنے کا فیصلہ کر کے فن کو امر کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔

Marfat.com

وقت کے ان دونوں چقماق پتھروں کے ٹکراؤ نے جس ابدی شعلے کو زندگی دی ہے اسکی حرارت نے ایک ہمہ جہت فنکار کے فن کو عمرِ دوام بخش دی ہے۔

آج کل معاشرے کی روندی ہوئی قدروں کی نذر کچھ خوبصورت اشعار!

کون بتائے آخر، کس کو، کس نے، کتنا لوٹا ہے
بستی بستی، چوروں نے بھی شور مچانا سیکھ لیا ہے

●

کاٹی ہیں میرے ہاتھ کی، ظالم نے انگلیاں
کیسے جلائے شہر میں، میرا ہنر، دیا

●

یہ کیسا دور ہے یارب کہ شر کی بستی میں
عذابِ جاں ہے ہمارا شرافتیں رکھنا

●

اک ہاتھ چُنتے چُنتے کانٹے لہو میں تر ہے
اک ہاتھ جل گیا ہے شمعیں جلا جلا کر

●

وہی اداسی، وہی سفر ہے، وہی درندے، وہی خطرے!
وہ جس میں تم گنتے تھے چاند تارے وہ شہر جنگل سا بھر چکا ہے

انوار فریدی کی شاعری مرگِ صدا، سہمی ہوئی خوشبو، آنکھیں اک لٹا گھر۔ زہر میں زمزم، خوابوں کے گہنائے سورج اور حنائے زخم جیسی زندہ ترکیبوں فکری استعاروں اور پُر مقاعد مضامین کی مُنہ بولتی اور جذبوں کی بند گرہیں کھولتی شاعری ہے جسے آج کی بانگِ درا پر گزشتہ سے پیوستہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

ہائیکوز، غزلوں، نظموں اور قطعات وغیرہ پر مشتمل مجموعہ کلام۔ "ہر شہر میں جنگل پھیل گیا" نہ صرف نذرِ قارئین ہے بلکہ اُردو ادب میں بھی ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

مسرت جبیں زیبا

(کویت)

Marfat.com

کربؒ کی دھوپ میں لپٹی ہچکیوں کا سفرنامہؒ

زخموں کی طرح ٹپکتی اور رتجگوں کے دھوئیں میں لپٹی آنکھیں اور شعلوں کی طرح دہکتے ہوئے احساسات رکھنے والوں کو اداسیوں اور سسکیوں کے نوحے تراشتے ہوئے میرے خوں چکاں قلم کی لہو لہو جنبشوں کا سلام پہنچے۔
میں اس مجموعۂ کلام "ہر شہر میں جنگل پھیل گیا" کی صورت میں اپنے عہد کی شکست و ریخت کی آواز میں لپٹی کُو بہ کُو پھیلتی ہوئی ہچکیوں اور پلک پلک اترتے ہوئے آنسوؤں کو سسکتے تڑپتے الفاظ کی ہتھیلیوں پہ سجا کر حساس دلوں اور گداز دھڑکنوں کے سپرد کر رہا ہوں۔ اس اطمینان کے ساتھ کہ اس مجموعۂ کلام کی کیفیات میں اترنے اور ڈوب جانے کا حق صرف حساس دل ہی ادا کر سکتے ہیں۔

دُور تا حدِ نظر ایک خاردار جنگل اپنی تمام تر وحشتوں کے ساتھ میرے سامنے ہے۔ کہرام مچاتی۔ بے معنی آوازوں کا گھنا جنگل ۔ سبز خوابوں کا لہو پیتا اور محرومیوں کا سیاہ دھواں اُگلتا سُلگتا اذر گیلا جنگل ۔ کرنوں کو ترسے ہوئے دریچوں سے اترتی وحشتوں اور دیوارِ جاں پہ پھیلتی بڑھتی دراڑوں کا موت کے سائے بانٹتا اندھا جنگل ۔ بے حسی، بے ضمیری اور مفاد پرستی کی تند و تیز اور زہریلی ہواؤں سے گونجتا جنگل ۔ سازشوں سے لبریز دماغوں اور نفرتوں کے تاریک روزنوں سے جھانکتی کدورتوں کا کالا جنگل، محبتوں اور چاہتوں کی بے گور و کفن لاشوں پر رقص کرتی ہوئی منافقت

کا ہرا بھرا جنگل ـــــ سونے چاندی کے کھنکتے سکوں کے اشاروں پر طوائف کی طرح ناچتے ہوئے قانون کے پاؤں میں بندھے انصاف کے گھنگھروؤں کی ماتمی صداؤں کا چیختا جنگل ـــــ اپنوں ہی کی گولیوں کی گھن گرج میں اپنوں ہی کے سینوں سے اُبلتے چھلکتے خون کے فوّاروں اور سُرخ دھاروں کا لہراتا جنگل ـــــ گوشت پوست کے بنے ہوئے انسانی جُثّوں میں دھڑکتے بجتے سنگ صفت دِلوں کا پتھریلا جنگل ـــــ دانش کے نُور سے محروم اور احساس سے عاری نام نہاد رہبروں اور محافظوں کے ناکارہ ذہنوں، تعفّن زدہ جسموں، مفلوج رویّوں، زہر اُگلتی سوچوں، شرارے بُنتے لفظوں اور بدباطنی کی کوکھ سے جنم لینے والے دعوؤں اور وعدوں سے شبِ تاریک کی طرح پھیلتی بے یقینی کی صلیب پر لٹکے زخم زخم خوابوں کا سِسکتا جنگل ـــــ دائیں بائیں، آگے پیچھے، ایک ہی سماں اور ایک ہی منظر!

اِک بستی کے حالات نہیں، اِک دو قریوں کی بات نہیں
ہر نگری میں، ہر گلشن میں، ہر مسکن میں، ہر آنگن میں
صحراؤں میں، کہساروں میں، ان گلیوں میں، بازاروں میں
ہر خواب کو ظلمت چاٹ گئی، ہر آنکھ میں کاجل پھیل گیا
ہر موڑ پہ وحشت گونج اُٹھی، ہر شہر میں جنگل پھیل گیا"

یہ معاشرہ، یہ ماحول جبر کی زہریلی ہواؤں، محرومیوں اور ناآسودگیوں کا وہ منظرنامہ ہے جہاں بہار اور پیار کے نغمے الاپنے والی مترنم کوئلیں زخمی ہو چکی ہیں۔ جہاں دھنک رنگ پروں والے مور سہمے اور امن کی فاختائیں خون میں تر ہیں، جہاں تیتریاں بھوک کے آہنی شکنجوں اور نوکیلے پنجوں میں کراہتی اور بس کراہتی چلی جا رہی ہیں۔ جہاں پرندوں کے پَر بندھے اور درندے

Marfat.com

کھلے عام دندناتے پھر رہے ہیں۔ لومڑ، شیر کی کھال پہن کر اترانے اور کوّے ہنس کی چال چلنے میں مصروف عمل ہیں جہاں زہریلے سانپ آستینوں میں پلتے اور سینوں پہ رینگتے ہیں اور ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک

ع ہر شاخ پہ اُلّو بیٹھا ہے انجامِ گلستاں کیا ہوگا

گیدڑ اناج کا رکھوالا ہو یا لیڈر سماج کا، اب تو کوئی فرق ہی محسوس نہیں ہوتا نسلیں یوں کٹتی ہیں جیسے فصلیں کٹ رہی ہوں۔

ہم کُوبکُو پھیلتی ہوئی منافقتوں، ناانصافیوں، وحشتوں، بے یقینیوں، محرومیوں اور اذیتوں کے گھنے جنگل میں گھرے ہوئے لوگ ہیں۔ آرزوؤں اور تمناؤں نے اپنی شفّاف جبینوں پر جن منزلوں کا پتہ تحریر کیا تھا، شاید وہ وقت سے پڑھا نہیں گیا۔ زندگی کے سال ڈاچیوں کی طرح سنہرے خوابوں کی گھنٹیاں بجا بجا کر گزرتے جا رہے ہیں اور صرف گزرتے ہی جا رہے ہیں، کہیں پہنچ نہیں پا رہے۔ پتہ نہیں ہم زندگی گزار رہے ہیں یا زندگی ہمیں گزار رہی ہے۔ ہم لمحے کاٹ رہے ہیں یا لمحے ہمیں "کاٹتے" چلے جا رہے ہیں۔ ہم تو ہنستے بھی ہیں تو لگتا ہے جیسے وقت ہم پہ ہنس رہا ہو۔ آنکھوں میں اب خواب نہیں عذاب اترتے ہیں۔ نیندیں نہیں رتجگے لہراتے ہیں۔ ہونٹوں پہ مُسکراہٹیں نہیں، مُسکراہٹوں کا ماتم بکھرتا ہے۔ اب محبتوں کے دھیمے دھیمے زمزمے نہیں نفرتوں کی چنگھاڑ گونجتی ہے۔ اب آنگنوں میں چاہتوں کی تتلیاں نہیں، کدورتوں کی بجلیاں رقص کرتی ہیں۔ لہو اب سفید نہیں ہوتا، کالا ہو جاتا ہے۔ کبھی الفتیں ضرورت ہوتی تھیں، اب ضرورتیں ہی اُلفت ہیں۔ ہم صرف سانس لیتے ہیں۔ جیتے نہیں عُمریں گزرتی جا رہی ہیں اور زندگی وہیں کی وہیں کھڑی ہے۔ دم بخود اور حیران و پریشان۔ بقول "پلکوں پار سمندر"

عُمر ہے بہتے ہوئے پانی کے دھارے کی طرح
زندگی جامد ہے دریا کے کنارے کی طرح

اب تو محروم اور مرحوم ہونے میں بھی فرق نہیں رہا۔ احساس لاشوں میں وجود قبروں اور چہرے کتبوں میں ڈھلتے جا رہے ہیں اور آنکھیں ان چلتے پھرتے مزاروں کے جلتے بجھتے چراغ ہی تو ہیں۔

یہ معاشرہ چلتی پھرتی لاشوں اور مزاروں کا معاشرہ ہی تو ہے، جو اپنے مضمحل کاندھوں پہ بے سود مسافتوں کا بوجھ لیے، وجود پہ صدیوں کی تھکن اوڑھے اور سروں پہ اپنی بجتی کھنکتی ہڈیوں کی گٹھڑیاں اُٹھائے شب و روز اپنے آپ کو گھسیٹنے اور بس گھسیٹنے ہی کے جاں گداز عمل سے گزرتا رہتا ہے۔ اور پھر ان ہڈیوں کی چٹخ سے اُٹھنے والی گونج اس غزل کا رُوپ دھارے اس منظر نامے کا ماتم کرتی دکھائی دیتی ہے۔

چہرۂ حالات کا بدلا ہُوا تیور ہوں میں!
وقت کی آنکھوں کا اک چھلکا ہوا ساغر ہوں میں
رہگذر کی گرد میں لپٹا ہُوا میرا نصیب!
کیا کسی کو دوش دُوں، کہ راہ کا پتّھر ہوں میں
اپنے ہاتھوں سے بجھائے میں نے اپنے سب چراغ
گڑ گیا جو اپنے ہی سینے میں وہ خنجر ہوں ـــ میں
اشک ہیں خوابوں کے قبرستان کے جلتے دیے
زندگی ہے قبر میں، خود قبر سے باہر ہوں میں

انسانی اقدار کے اس عہدِ تنزّل کو مادی اور سائنسی ترقی کی تمام تر تیز رفتاری کے باوجود ارتقاء کے نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر انسانیت

اور محبت کی عظیم اقدار پر یقین نہ رہے تو قلبِ انسانی میں ایک ایسے خلا
کا پیدا ہونا ناگزیر ہوجاتا ہے، جسے کوئی اور جذبہ پُر نہیں کرسکتا۔
رابرٹ بریفالٹ "THE MAKING OF HUMANITY"
میں رقم طراز ہے کہ "اگر انسان بادلوں سے اونچا اڑنے لگ جائے تو
اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسانیت کی سطح بھی اتنی ہی بلند ہوگئی ہے اور نہ
ہی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار کے معنی ترقی ہیں بلکہ انسانی معاملات اس سے
کہیں گہرے ہوتے ہیں۔"

اس موجودہ نام نہاد ارتقاء کے بارے میں ڈین انج لکھتا ہے
"اگر آج کی دُنیا کی حالت کو دیکھا جائے تو مجبوراً مجھے ہکسلے کے اس نتیجے
سے متفق ہونا پڑے گا کہ ترقی کے مسلمہ معیار کے مطابق اس دور کی ترقی
ترقی نہیں بلکہ تنزّل ہے۔"

(THE FALL OF IDOLS)

اس عہد بے مایہ کا تمام تر دارومدار بددیانتی، بدمعاملگی، وعدہ خلافی
فریب دہی، کذب و نفاق اور مکر و افتراق کے سوا اور کیا ہے؟ جو
سب سے زیادہ کامیابی سے دھوکا دے سکے وہی سب سے بڑا مدبّر،
جو جس قدر زیادہ صفائی سے جھوٹ بول سکے وہ اسی قدر دانا، جو روشنی
کے نام پر جس قدر مکر و فریب کے ساتھ دوسروں کی آنکھوں پر پٹی باندھ
سکے وہ اتنا بڑا رہبر، جو جتنا بڑا لٹیرا، ظالم اور جابر وہ اسی قدر قابلِ
عزّت و تکریم۔ جو جتنا بڑا بددیانت، چور اور خائن وہ اتنا بڑا امین۔
اور جو جس قدر پیار، محبّت اور اخلاص کا پیکر وہ اتنا ہی زیادہ مشکوک، اور
جو حالات کا مارا جس قدر زیادہ غریب، مجبور اور مفلس و قلاّش وہ اتنا ہی

قابلِ نفرت، لائقِ تضحیک اور کمّی کمین ۔ اس مجبور وناتواں طبقے کی حالتِ زار کا ذکر کرتے ہوئے بیسویں صدی کا ایک معروف فلسفی اور ادیب خلیل جبران (المتوفی ۱۹۳۱ء) لکھتا ہے :

" غریب کی ناتواں ہستی سینۂ زمیں پر بوجھ سمجھی جاتی اور بے مہر دنیا کے ہاتھوں برباد کی جاتی ہے اور پھر کسی خزاں رسیدہ پتّے کی طرح نوچ کر پھینک دی جاتی ہے ۔ گناہِ غریبی نے اُس کی راہ کو پُرخار بنا دیا ہے اور عرصۂ حیات کو بے حد طویل اور بھاری ۔ جیسے وقت کی سوئیاں پیچھے مڑ کر رہ گئی ہوں پھر مصائب کا ہولناک سمندر ہے ۔ دکھوں کی گرجتی ہوئی موجیں ہیں اور تکالیف کے مدّو جزر ۔ اس کی نگاہیں دُور اُفق پر کسی چیز کو تلاش کرتی اور غمناک آنکھیں دریائے الم میں تیرتی رہتی ہیں ۔ اس کے اداس چہرے پر رنگتِ ملال لمحہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور پھر اسی طرح قیدِ حیات پوری ہو جاتی ہے جس طرح ہوا کے جھونکے سے ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ گُل کر دیا جائے ۔ اس کے ارمانوں کے ہجوم پر یاس کی اوس پڑتی اور ہر گزرتی گھڑی سوگوار بنتی چلی جاتی ہے اور یوں زندگی ناکام آرزوؤں کا فسانہ اور ہیبت ناک خواب کا رُوپ دھار لیتی ہے اور یہ تمام صرف اس جرم کی پاداش میں ہے کہ بے چارہ ' غریب ' ہے ۔ "

(حکایتِ دل ص ۱۰۸ - ۹)

گویا غربت ایک جرم ہے ، سنگین جرم اور گناہِ غریبی کے اس گنہگار اور مجرم کو زندہ رہنے کا بھی کوئی حق نہیں ۔ نہ اُس کے جذبات کی کوئی اہمیت نہ اس کے احساسات کی کوئی حیثیت ۔

بقول " پگھل جائیں گی زنجیریں "

Marfat.com

گھر پاتال میں، مٹی میں ہیرے رُلتے دیکھے ہیں
ہماری آنکھ نے پھولوں میں پتھر تُلتے دیکھے ہیں
غریبوں کے ہزاروں اشک بھی جن کو نہ دھو پائیں
وہ دھبّے زر کے کچھ قطروں سے ہم نے دُھلتے دیکھے ہیں

جہاں عزّت وعظمت اور اخلاق و شرافت کا معیار فقط دولت و زر ہی قرار پا جائے، جہاں دوسروں کے دُکھ درد کے افق سے طلوع ہوتی پلکوں کی نمی کو مفادات کے گھنے جنگلوں کی زہریلی ہوائیں چاٹ جائیں۔ جہاں انسانیت کی پہچان کے پیمانے ہی بدل چکے ہوں، جہاں آنکھوں میں موجزن محبّت، خلوص اور وفا کا سمندر ایک افسانہ اور جہالت و بے ضمیری کی کھُردری اور سیاہ ہتھیلیوں پر دھرے زر کے کچھ قطروں کی چمک ہی ایک ابدی حقیقت قرار پا جائے وہاں یہی کچھ نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا! یہاں کل بھی یہی کچھ تھا اور

؎ آج بھی لپٹی ہوئی ہیں تن بدن سے وحشتیں
رات سے تاریک اپنی رہگذر ہے آج بھی
عظمتِ انسان کا معیار کل بھی زر ہی تھا
عظمتِ انسان کا معیار زر ہے آج بھی

اس معاشرتی ناہمواری اور غربت و افلاس کے شکنجوں میں جکڑا اور زر وسیم کے پیمانوں پر انسان کو ناپتی، تولتی اور پرکھتی آنکھوں میں گھِرا ایک مفلس اور مجبور حالات کی اِن چیرہ دستیوں کو دیکھتا ہے، تو پُکار اُٹھتا ہے ؎

نگاہیں میرے گرد آلود چہرے پر ہیں دُنیا کی
جو پوشیدہ ہے باطن میں وہ جوہر کون دیکھے گا

Marfat.com

یہاں تو سنگِ مرمر کی چمک پہ لوگ مرتے ہیں
مرے کچے مکاں، تیرا کھُلا در کون دیکھے گا

ہماری معاشرتی زندگی اور ماحول سراسر میکانکی تصورِ حیات کا آئینہ دار بن چکا ہے، جس سے اُن جذبات و احساسات کی نمو نہیں ہوتی جو دِل کی اتھاہ گہرائیوں سے اُبھرتے اور افقِ حیات پہ چھا جاتے ہیں۔

اس میکانکی نظریہ حیات کی رو سے تمام کائنات اور خود انسان کی حیثیت اس مشین سے مختلف نہیں جس میں حرکت تو ہوتی ہے، لچک نہیں، وہ ان تمام تر حسیاتِ لطیفہ سے عاری ہوتی ہے، جن سے جذب و ادغام باہمی مودت و محبت، ایثار و خلوص اور احسان و مروّت کے روح افزا سوتے پھوٹتے ہیں۔ اسی حقیقت کو بے نقاب کرتے ہوئے علاّمہ اقبالؔ نے کہا تھا: ؎

ہے دِل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

اور جب لوگ زندگی اور اس کے حقائق کو ریاضی کی مساواتوں، فزکس کے میکانکی نظریوں، اور کیمسٹری کے غیر نامیاتی (INORGANIC) قاعدوں کی رو سے حل کرنے کی کوشش میں مگن ہوں تو نتیجۃً زندگی کے لطیف پہلو اور احساسات نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور یوں وہ انسانوں سے ایک "لٹھ" کا روپ دھار لیتے ہیں، جنہیں کلامِ الٰہی کَاَنَّھُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَۃٌ (گویا وہ خشک لکڑیاں ہیں جنہیں لباس پہنا دیا گیا ہو) سے تعبیر کرتا ہے اور یوں وہ معاشرہ خشک لکڑیوں اور بے برگ و ثمر

درختوں کا ایک جنگل بن کے رہ جاتا ہے اور پھر اس معاشرتی کیفیت کو کلامِ الٰہی " تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى " (بظاہر ایک جگہ جمع لیکن ان کے دِل جُدا جُدا) کے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اس طرح انسانوں کے اس ہجوم میں یہ کیفیّت ایک ناسور کی طرح پھیلی دکھائی دیتی ہے جہاں

ع دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

اگر ہم اپنے سیاسی حالات اور ماحول کا جائزہ لیں تو ہمیں یہاں عملی طور پر میکیاؤلی (۱۵۲۷ — ۱۴۶۹) ہی کا نظریہ کارفرما نظر آتا ہے، جس کے مطابق ہر وہ حربہ جس سے اقتدار کی قوّت بڑھے نہ صرف جائز بلکہ مستحقِ ستائش ہے اور ہر وہ فریب جس سے کامیابی کا امکان ہو وہی قابلِ صد تحسین ہے۔ اس نظریۂ سیاست کے مطابق عدل و انصاف صرف قوّت ہی کا نام ہے اور حق اسی کا ہے جس کے پاس قوّت ہے۔

(THE PRINCE) نامی کتاب جسے میکیاؤلی سیاست کا صحیفہ سمجھا جاتا ہے اس میں میکیاؤلی رقمطراز ہے۔

" جو بادشاہ اپنے پاؤں مستحکم رکھنا چاہتا ہے اس کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ بدی کس طرح کی جاتی ہے اور اس کے لیے کون سا وقت سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اس میں خوبیوں کا ہونا ضروری نہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ بظاہر معلوم ہو کہ اس میں خوبیاں موجود ہیں۔

وہ بظاہر ایسا دکھائی دے کہ وہ بڑا رحم دِل، وفاشعار، نیک اطوار مذہب پرست اور صداقت پسند ہے۔ اس میں چنداں مضائقہ نہیں، اس میں ان سے کوئی خوبی سچ مچ پیدا ہو جائے۔ لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ اُس کے دل کی حالت ہمیشہ ایسی رہے کہ جونہی وہ دیکھے کہ مصلحتِ وقت کا تقاضا

ہے کہ اب اس خوبی کو یکسر علیحدہ کر دیا جائے تو وہ بلا تامل و توقف اس کے خلاف عمل کر سکے۔

(CHAPTER 8th)

ہمارے اربابِ سیاست کا کردار کیا میکیاؤلی کے اس نظریۂ سیاست سے مختلف ہے ؟ ان کے عوامی ہمدردیوں سے مزین بیانات، خطابات اور بلند و بانگ دعوؤں کو دیکھیں تو لگتا ہے کہ جیسے

ع سارے جہاں کا درد انہی کے جگر میں ہے

لیکن ان کے اعمال و افعال کا جائزہ لیا جائے تو

ع آستیں میں دُشنہ پنہاں، ہاتھ میں خنجر کھُلا

کی کیفیات اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ نقطۂ کمال پہ فائز دکھائی دیتی ہیں۔

CAVOUR جسے متحدہ اطالیہ کا معمار کہا جاتا ہے۔ کہا کرتا تھا کہ "اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لیے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لیے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیاطین کہلائیں"۔ مگر یہ اربابِ سیاست ملک و قوم کے ساتھ یہ "شیطانیاں" کر کے بھی معزز کے معزز ہی رہتے ہیں۔ بقول کسے

تمہاری زلف میں پہنچی تو حُسن کہلائی
وہ تیرگی جو مرے نامۂ سیاہ میں تھی

تو جب معاشرے کے سیاسی اور سماجی حالات اس سانچے میں ڈھل جائیں کہ رگیں چھیلتی جراحتیں اور زخم بانٹتی ہوائیں ایک تسلسل کے ساتھ روزن روزن اترتی اور دھڑکن دھڑکن پھیلتی جا رہی ہوں تو وہ معاشرہ کیا انسانی معاشرہ کہلا سکتا ہے ؟

MAX EAST MAN اس انسانی جنگل کی دگرگوں حالت کو دیکھ کر

پکار اُٹھا کہ :

"کوئی زندہ اور باہوش انسان جو ذرا اس امر کا تصور کرلے کہ یہاں ہو کیا رہا ہے تو اس قسم کی دُنیا میں ایک ثانیہ کیلئے بھی رہنا گوارا نہ کرے"۔

(ANNIHILIATION OF MAN)

بقول "پلکوں پار سمندر"

جسم ہے میرا یہاں آباد لیکن دل نہیں
جی رہا ہوں جس میں یہ دُنیا مرے قابل نہیں

افراتفری کے اس ماحول پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر ولیم سٹیکل (W. STEKEL) لکھتا ہے

"چوری ایک مہذب جرم بن چکی ہے، صرف اُس کا نام بدل گیا ہے۔ اب اسے کاروبار (BUSINESS) کہا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں رہی۔ قتل ایک عام بات ہو چکی ہے۔ سرمایہ شہنشاہِ مطلق ہے۔ معاشرہ کی شرم کا اب احساس تک نہیں رہا۔ اب صرف اُسے شرم آتی ہے جو دوسروں کا خون چوسنے میں ناکام رہ جاتا ہے"۔

اس ہولناک تباہی کے اصل باعث پر گفتگو کرتے ہوئے مشہور امریکی مؤرخ DORSEY کہتا ہے کہ

"اس معاشرتی تباہی کا سبب نہ تو بڑے بڑے مجرم ہیں، جن سے ہم لرزاں رہتے ہیں اور نہ ہمارا افلاس جس سے ہم نالاں ہیں بلکہ اس کا اصل باعث وہ معاشرتی نظام ہے جو منافقت اور فریب کی بنیادوں پر قائم ہے اور اس کے ساتھ یہ قانون کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس"۔ (CIVILISATION)

یہ احساسات صرف مغربی مفکرین ہی کے نہیں بلکہ دردِ دل اور زندہ

احساس رکھنے والے ہر اس شخص کے ہیں۔ جس کے پیچھے ایک عفریتِ بے پناہ ہے اور سامنے کوہِ آتش فشاں سے اُمڈ کر آنے والا آگ کا سیلاب۔ یہ تاثرات عمومی کرب سے دوچار ہر اس فرد کے ہیں جس کی ایک ایک شریان خون کا فوّارہ بن چکی ہے۔ یہ چیخ و پکار اُس بے بس انسان کی ہے جسے کسی جنگل میں چاروں طرف درندوں نے گھیر رکھا ہو اور اردگرد اُبھرنے والی آہٹیں اُسے موت کا پیغام بن کر سنائی دے رہی ہوں اور باہر نکلنے کا راستہ بھی سجھائی نہ دے رہا ہو، جو اپنے گرد و پیش نگاہ دوڑاتا ہے تو اس کا رواں رواں پکار اُٹھتا ہے۔

؎ وہی اداسی، وہی سفر ہے، وہی درندے، وہی خطر ہے
وہ جس میں اُگتے تھے چاند تارے، وہ شہر جنگل سے بھر چکا ہے

اس شبِ تاریک کے اذیّت ناک جبر میں اس کے شبنمی احساس میں محرومیوں کا گھلا ہُوا زہر اس کی بے بسی کی چیخ بن کر ان اشعار میں ڈھل جاتا ہے۔

کچھ کم نہیں تھیں دن کی دہکتی اذیّتیں
ہمراہ لے کے آئی ہے شب بھی اذیّتیں
یارب لہو اگلنے لگی زندگی مری
اب تو کوئی سمیٹ لے میری اذیّتیں

عصرِ حاضر کے اس کرب ناک ماحول میں سانسیں گنتے اور ہچکیاں بھرتے ہوئے بے بس انسان کی انہی چیخوں کو میں اپنی شاعری کے جوفِ سینہ میں انڈیلتا اور انہیں ہوک بنا کر کاغذی پیرہن پہنا دیتا ہوں اس مجموعۂ کلام میں

ع میرے پاؤں میں وہی غم کا بھنور ہے آج بھی
ع چہرۂ حالات کا بدلا ہوا تیور ہوں میں
ع کبھی لبوں پہ بچھا لیا چُپ کا جال میں نے
ع جو میرے ہر غم کو اپنے سینے لگا کے روتا، کوئی تو ہوتا
ع کفِ وجود پہ رکھا ہُوا عدم ہُوں میں

جیسی غزلیں اور یاد، خزاں، اے کاش اور الوداع وغیرہ جیسی نظمیں ناآسودگیوں کے جہنم میں جلتے ہوئے ان کروڑوں انسانوں کے جذبات کا اظہار ہے جن کے شب و روز اپنے ہی آنسوؤں کے چناب پار کرتے بسر ہو رہے ہیں اور جن کے پاؤں میں محرومیوں کے بھنور بندھے ہیں۔ میری اس "میں" کے اندر پورا معاشرہ آباد ہے۔ فنکار جب تک اِرد گرد بکھری ہوئی ہچکیوں، آنسوؤں اور آہوں کو اپنی رگِ جاں میں نہیں پروتا اس کا فن نکھرتا نہیں۔ یہ "میں"، "میرا"۔ اور "میرے" جیسے متکلم کے الفاظ ایک ایسی اکائی ہوتے ہیں، جن کی رگوں میں لاکھوں، کروڑوں انسانوں کے احساسات کا لہو دوڑتا ہے اور یوں ہر دل کی دکھن میری شاعری کا اثاثہ اور ہر سینے کا زخم میرے فن کا سرمایہ ہے۔ بقول فیض احمد فیضؔ:

"اپنے من میں ڈوب کر صوفی کو تو شاید زندگی کا سراغ مل سکے، لیکن ایک ادیب یا شاعر کو یہ سراغ لگانے کے لیے اپنے من ہی میں نہیں اپنی ہم عصر انسانی برادری کے من میں بھی ڈوبنا پڑتا ہے۔ اسے یہ جوہر ودیعت ہی اسی لیے کیا گیا ہے کہ کم نگر اس کی آنکھوں سے نیک و بد کو پہچان سکیں۔ اور کج مج زبان اس کی زبان سے اپنے درد و کرب، غیظ و غضب یا امید و طرب کا اظہار کر سکیں۔"

احساس کی سماعتیں زنگ آلود نہ ہوں تو پلکوں کا یہ گونگا پانی بھی ایک گونج بن کر چاروں اور بکھرتا دکھائی اور سُنائی دیتا ہے۔

ے
صدا کھو جائے غم کے جنگلوں میں
تو دُکھ اپنے دریچے کھولتے ہیں
بیاں آواز کا محتاج کب ہے
زباں چُپ ہو تو آنسو بولتے ہیں

میرا یہ مجموعۂ کلام دُکھوں کے میلے میں رقص کرتے ہوئے اُن آنسوؤں کی جھنکار ہے، جن کی کوکھ سے انقلاب جنم لیتے ہیں۔ یہ ان فلک شگاف چیخوں کا اظہار ہے جو انقلاب کا نعرۂ مستانہ بن کر رگوں میں گونجنے لگتی ہیں۔ دُنیا کا ہر انقلاب آنسوؤں ہی سے تراشا اور نکھارا جاتا ہے۔ جذبوں کے شعلے آنسوؤں ہی سے تُند ہوتے اور پھر لہو سے رنگ پکڑتے ہیں۔

اور یہ کوشش بھی میرے فن کا ایک اہم تقاضا ہے کہ کوئی انسانی جذبہ بے اظہار نہ رہ جائے۔ قلم کی نوک ضمیرِ آدم کی زبان ہوتی ہے۔ اگر ضمیرِ آدم ہی سسکیاں لے رہا ہو تو قلم مُسکرا نہیں سکتا۔

بقول میر:

ع دردِ غم کتنے کئے جمع تو دیوان ہوا

اور بقول غالب:

ع پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

اور ویسے بھی ایک زندہ اور گہرا احساس رکھنے والا انسان یہاں آخر ہنسے بھی تو کس بنیاد پر؟ بقول کسے

یا تو دیوانہ ہنسے یا تُو جسے توفیق دے
ورنہ اس دُنیا میں آکر مسکراتا کون ہے

Marfat.com

کچھ یوں بھی سفرِ حیات میں دکھوں کی دھوپ زیادہ اور خوشیوں کے سائے کم ہوتے ہیں۔ زیست کی انہی جلتی بجھتی راہوں پہ چلتے چلتے جب چھاؤں کا مرحلہ آتا ہے تو آنسو وقت کا کفن اوڑھ کر ہنسی کی خاک میں دفن ہو جاتے ہیں۔ اور جب آلام کا سورج سوا نیزے پہ چمکتا اور دکھ کا محشر بپا ہوتا ہے تو ہنسی کی قبر پھٹ جاتی ہے اور آنسو زندہ ہو کر اس قبر سے باہر نکل آتے ہیں۔ بقول خلیل جبران:

"ہم غموں کے بیٹے ہیں اور غم خدا کا سایہ ہے جو گنہگار دلوں کے آس پاس اپنا گھر نہیں بناتا۔ ہماری روحیں اداس ہیں اور اداسی ایک بلند مرتبہ ہے جو حقیر روحوں کو نہیں ملتا۔ اے ہنسنے والو! ہم روتے ہیں نالہ و ماتم کرتے ہیں اور جس نے ایک مرتبہ اپنے آنسوؤں سے غسل کر لیا۔ وہ ابدالآباد تک پاک وصاف ہو گیا۔"

پھر یہ معروف فلسفی احساس سے عاری پتھر دلوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے:

"ہم آہیں بھرتے ہیں اور ہماری آہوں کے ساتھ پھولوں کی سرگوشیاں شاخوں کی سرسراہٹیں اور آبشاروں کے نغمے بلند ہوتے ہیں۔ لیکن تم ہنستے ہو اور تمہارے قہقہوں میں کھوپڑیوں کے پسنے کی آواز، بیڑیوں کی جھنکار اور دوزخ کی چیخ و پکار شامل ہوتی ہے — ہم روتے ہیں اور ہمارے آنسو زندگی کے دل میں ٹپکتے ہیں۔ جس طرح شبنم کے قطرات رات کی پلکوں سے صبح کے جگر میں اُترتے ہیں۔ لیکن تم ہنستے ہو۔ اور تمہارے متبسّم ہونٹوں سے قہر و غضب بہتا ہے۔ جس طرح سانپ کا زہر ڈسے ہوئے آدمی کے زخموں سے ٹپکتا ہے۔ ہم روتے ہیں، اس لیے کہ بیواؤں کی مظلومی و بے چارگی اور یتیموں کی بدبختی و

بے دست وپائی کو دیکھتے ہیں۔ اور تم ہنستے ہو، اس لیے کہ تم سونے کی چمک کے سوا کچھ نہیں دیکھتے۔ ہم روتے ہیں، اس لیے کہ غریبوں کی کراہ اور مفلسوں کی پکار سنتے ہیں اور تم ہنستے ہو، اس لیے کہ تم جام وساغر کی کھنک کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتے ہو۔ ہم روتے ہیں اس لیے کہ ہماری رُوح ذاتِ خدا سے جدا ہو کر جسم میں مقیّد ہو گئی ہے اور تم ہنستے ہو، اس لیے کہ تمھارے جسم راحت واطمینان کے ساتھ مٹی سے چمٹے ہوئے ہیں۔

(بنفشہ کا پھول ص ۱۰۶-۱۰۷)

یونانی المیہ نگار اسکائی لس نے کہا تھا کہ دِل پہ جمی گرد کو غم کا پانی ہی دھو سکتا ہے۔ گویا:

کھُل کر جو رو لیا تو مری رُوح دُھل گئی
آنسو جو کام کر گئے، دریا نہ کر سکا

حساس دِلوں، گداز دھڑکنوں اور دُنیا کی اصلیت اور حقیقت کی تاریک گہرائیوں میں اترنے والی شفاف آنکھوں کے لیے تو یہاں قدم قدم قیامتیں بپا ہیں۔ ان کا احساس ان حشر انگیزیوں کے جھُرمٹ میں خود سراپا حشر ہو جاتا ہے اور یوں وہ لمحہ لمحہ جلنے اور پگھلنے کے عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔ انہیں ان کے احساس کو تابندہ رکھنے والے دُکھ، سُکھ سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں کہ یہ انہیں پتھر نہیں ہونے دیتے۔ انہیں جھوٹی مسرتوں کے ظاہری لبادوں سے باطن کے کرب زیادہ محبوب ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ بے روح اور بے معنی قہقہوں کی کھوکھلی جھنکاریں بے حسی کی سنگلاخ چٹانوں سے پھوٹتی اور انہی پتھریلی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں، لیکن ریشم کی طرح نرم ولطیف احساسات کے جھروکوں سے نکلنے اور شبنمی پھواروں کی طرح ٹپکنے والے آنسو اُن پتھریلی

چٹانوں کا جگر بھی چاک کر جاتے ہیں۔
وہ آنسو، جو چشمِ زہد اُچھالے تو فرشتے اِن جواہر و یاقوت کو اپنے نورانی پروں پہ سجالیں۔ وہ آنسو، جو اشکِ ندامت میں بدلیں تو سات سمندروں سے بھی نہ بجھنے والے جہنم کی دہکتی فضاؤں کو بھی گلزار بنا دیں ــــ وہ آنسو، جو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اُبھریں تو دستِ قدرت اُنہیں قبولیت کی سات رنگوں میں ڈوبی چمکتی شعاعوں کی سنہری ڈور میں پرو دے، وہ آنسو، جو مظلوم کی آنکھ سے ٹپکیں تو عرشِ الٰہی بھی اُن کی گونج کے استقبال کے لیے بے تاب ہو جائے ــــ وہ آنسو، جو محبت کی بھیگی پلکوں سے ٹوٹیں تو ہوائیں انہیں دستک بنا کر محبوب کی دہلیز پہ سجدہ ریز کر دیں ــــ وہ آنسو، جو ہجر کے دشتِ بے کنار کے دامن پہ گریں تو اداس لمحوں کے غزال انہیں سلامی دیں۔ وہ آنسو جو دُکھوں کی دہلیز پہ چمک اُٹھیں تو جسموں کی بُجھی بُجھی شریانوں اور خُنک خُنک لہو کی بوندوں میں تازہ حرارتوں کی شمعیں گھول دیں ــــ وہ آنسو، جو محرومیوں کی خُشک اور خزاں رسیدہ شاخوں پہ بیٹھ کر گنگنائیں تو اداسیوں کے گھنے جنگلوں میں گھرے ہوئے اضطراب کے جگر سے ہُوک بن کر پھوٹنے والی چنگاریاں کبھی ابرِ نیساں کے سنگ سنگ جھومتے گلابی موسموں کے مُژدوں اور آہٹوں کو ترسی ہوئی اجاڑ رُتوں کی صدا بن کر افقِ حیات پہ چھا جائیں تو کبھی حرفِ دُعا میں ڈھل کر پکار اُٹھیں کہ مولا! اس چاروں اور پھیلے ہوئے حبس بے کراں میں کوئی ایک جھونکا کہیں سے آئے اور چُپکے سے لہولہو خوابوں کی اُجڑی جبینوں پہ شبنمی انگلیوں سے "زندگی" تحریر کر جائے، جو تپتی ہوئی امیدوں اور تمناؤں کے سلگتے جھلستے ماتھے پہ (ایک پل ہی سہی) یوں حیات بخش ہاتھ رکھ جائے کہ اس کی

Marfat.com

تاثیر جسم کی شریانوں میں سفر کرتی کرتی روح کی اتھاہ گہرائیوں تک اُتر جائے۔ آنسوؤں کی ان صداؤں کے اُبھرنے اور ڈوبنے کے منظر مجھے سنائی بھی دیتے ہیں، اور دکھائی بھی دیتے ہیں اور کبھی تو یہ منظر میری اتنی دسترس میں ہوتے ہیں کہ میں انہیں اپنے بدن پہ لپیٹ لیتا ہوں۔ میرا احساس ان صداؤں کی انگلیاں تھامے جب شاہراہِ فن پہ چلتا ہے تو جذبہ و خیال کی مشترکہ سرحدوں پہ پڑنے والے احساس کے قدموں کی ہر دھمک ایک نغمہ بن کر گونج اُٹھتی ہے۔ ان نغموں میں درد کی دلدوز کراہوں کی جھنکار بھی ہو سکتی ہے اور چاہتوں کی سنہری کرنوں کے سنگ سنگ خوشبو کی طرح بکھرنے والا محبتوں کا جلترنگ بھی۔

عصرِ حاضر کی تہہ در تہہ تاریکیوں کا مداوا صرف اور صرف محبت ہے۔ حالات کے سانسوں کا الجھا ہوا ریشم اگر کوئی ہاتھ سلجھا سکتا ہے تو وہ محبت کا ہاتھ ہے۔ محبت خدا اور محبوبِ خداؐ سے، محبت وطن سے، محبت انسان سے بلکہ خدا اور رسولؐ سے محبت بھی انسانیت کی محبت ہی سے معتبر قرار پاتی ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

کُو بہ کُو پھیلی ہوئی نفرتوں کے زہر کا تریاق محبت کے سوا کچھ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ احترامِ انسانیت اور باہمی مؤدت و محبت کی عظیم حقیقتوں کو تسلیم کئے بغیر کبھی کوئی معاشرہ وحشتیں لٹاتے جنگل سے شہرِ امن و سلامتی اور خطۂ مہر و وفا میں ڈھلا ہے، نہ ڈھلے گا۔ مگر خدا جانے صرف FORMALITIES اور رسموں کے سہارے کھڑے یہ رشتے اور تعلق دلوں

کے سہارے کب کھڑے ہوں گے۔ زندگی تو محبت ہی کے لیے بہت تھوڑی ہے، لوگ نہ جانے نفرتوں کے لیے وقت کہاں سے نکال لیتے ہیں۔

بقول کسے ؎

تو ملا ہے تو اب یہی غم ہے

پیار زیادہ ہے زندگی کم ہے

محبت ہے کیا؟ اہل لغت کے ہاں متعین محبت کے معانی کو دیکھا جائے تو یہی دھنک رنگ جذبہ زندگی کی اہم اور مؤثر ترین حقیقت قرار پاتا ہے۔

بعض اہلِ لغت لفظِ محبت کو حَبَّۃٌ بمعنی بیج سے مشتق اور ماخوذ تسلیم کرتے ہیں۔ جس طرح بیج ایک درخت کی اصل اور ابتداء و انتہاء ہوتا ہے۔ اس طرح محبت ہی انسانی شجرِ وجود کی اول و آخر حقیقت اور اصل قرار پاتی ہے۔ سرزمینِ دِل سے اُگنے والے شجرِ محبت کی جڑیں انسان کے روئیں روئیں میں اترتی اور نس نس میں سما جاتی ہیں۔

خلوص اور وفا کی گہری چھاؤں، حسنِ اخلاق کے ثمر، مروت و احسان کے خوشنما برگ و بار اخوتوں اور چاہتوں کی پُر بہار شاخوں اور جذبہ و احساس کے خوشبودار پھولوں سے مزین یہی شجرِ محبت انسانیت کی علامت اور حوالہ قرار پاتا ہے اور جس طرح ایک درخت خود دھوپ میں جل کر بھی دوسروں کے جلتے بدن پہ ٹھنڈی چھاؤں کی ردا لپیٹتا ہے، اسی طرح محبت انسان کو اسی خصوصیت کا پیکر بنا دیتی ہے اور یوں اہلِ دِل پتھر کھا کر بھی دُعائیں دیتے اور زخم سہ کر بھی پھول بانٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ گویا محبت پکار پکار کر اعلان کرتی ہے

؎ میں وہ شجر ہوں جو خود کڑی دھوپ کی اذیت میں جل رہا ہے
مگر جھلستی ہوئی رُتیں اوڑھ کر بھی سایا اُگل رہا ہے

عرصۂ حیات میں ان جھلستی ہوئی رُتوں اور محبتوں کی کوکھ سے جنم لینے والے دُکھوں سے بھی اہلِ محبت پیار کرتے ہیں۔ اور اس کی تائید و محبت کا وہ معنی بھی کرتا ہے جس کے مطابق "حُب" سے مُراد وہ چار لکڑیاں لی جاتی ہیں، جو پانی سے بھرے ہوئے مٹکے کا بوجھ اُٹھاتی اور وزن کو برداشت کرتی ہیں۔ اسی طرح محبت بھی محبُوب کی جانب سے آنے والے دُکھوں، مصیبتوں اور جفاؤں کو سہتی اور برداشت کرتی ہے یہی وہ مقام ہے جہاں محبّت کرنے والے دُکھ اُٹھا کر بھی سراپا نیاز ہو کر محبوب کی بارگاہ میں پکار اُٹھتے ہیں۔ ؎

جان از درد و غمت شاداں شود
از بلایت سینہ آباداں شود

یعنی ہر وہ امتحان جو دوست کی طرف سے آتا ہے اس امتحانِ اذیت اور آزمائش میں بھی ایک گونہ تسکین مضمر ہوتی ہے پھر اہلِ طلب صدا دیتے ہیں اے محبوب میری جان تیرے غم میں شاد اور تیری آزمائش میں آباد ہے

عربی زبان میں تیز بارش یا تپش کی شدّت کی بنا پر سطحِ آب پر پیدا ہونے والے مضطرب بلبلوں کو حبب الماء یا حباب الماء سے موسوم کرتے ہیں۔ بعض اہلِ لغت نے اس اضطرابی کیفیت کی بناء پر لفظِ محبّت کو اسی سے مشتق جانا۔ بقول حضرت خواجہ بہاؤ الدّین رح۔

ع بحر یست قطرہ ہا بر آں آید از و

کہ محبت ایک ایسا سمندر ہے جس سے قطرے جوش سے باہر آتے رہتے ہیں۔ انہی دردانگیز کیفیات میں ہجر و فراق کی مضطرب لہروں کے سنگ سنگ چلتے جذبوں کی ترجمانی کرتے ہوئے میاں محمد بخشؒ فرماتے ہیں۔

رات پوے تے بے درداں نوں نیند پیاری آوے
درد منداں نوں یاد سجن دی ستیاں آن جگاوے
کر کر یاد سجن نوں کھاندے بھُن بھُن جگر نوالے
شربت وانگ پیادے ہتھوں پیندے زہر پیالے

اس شجرِ محبت پر اُگنے والے جدائی کے کانٹوں سے جب احساس کی پوریں زخمی ہو جاتی ہیں تو اُن سے ٹپکنے والے لہو میں ڈوب کر اور شدتِ شوق کی حدتوں میں اضطراب کے اُبلتے پانیوں کی جھلستی آواز کو ہم نوا بنا کر حضرت خواجہ غلام فریدؒ کا قلم بھی پکار اُٹھتا ہے۔

ہے ہے یار بروچل ہک تل ترس نہ کیتا
کر کے سخت نمانڑیں، انہڑیں نال نہ نیتا
ہجر پیالہ ازلوں، میں مٹھڑی لہو پیتا
جیں ڈینہ سجن سدھائے، ڈکھ آیا سُکھ بیتا

" ہائے، بلوچ محبوب نے ایک تل کے برابر بھی ترس نہ کیا، مجھے سخت بے آسرا کر کے چھوڑ گیا اور اپنے ساتھ نہ لے گیا، مجھ بد نصیب نے ہجر کا پیالہ ازل سے ہی گھول کر پی لیا تھا۔ جس دن سے محبوب رُخصت ہوا ہے۔ اس دن سے سکون بھی چلا گیا اور اس کی جگہ دُکھ آ گیا ہے۔"

اور کبھی عالمِ فراق اور حالتِ انتظار کی گھلی ملی کیفیات کو خواجہ غلام فریدؒ یوں زبان دیتے ہیں۔

مساگ ملیندی دا گزر گیا ڈینہ سارا
سنگار کریندی دا گزر گیا ڈینہ سارا
کجلا پائیم، سرخی لائیم، کیتم یار وسارا
کاگ اڈیندڑے عمر وہائی آیا نہ یار پیارا

یہاں یہ امر پیشِ نظر رہے کہ مندرجہ بالا اشعار میں بر وچل، مساگ، سنگار کجلہ اور سرخی کے الفاظ کو استعارۃً استعمال کیا گیا ہے۔

بقول غالب:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اہلِ تصوّف شعراء مجازی رنگ میں حقیقت کی بات بڑے خوبصورت انداز میں کر جاتے ہیں۔ جس طرح وارث شاہ جنہیں پنجابی ادب کا شکسپیئر کہا جاتا ہے، نے تلاشِ محبوب میں سرگرداں، صحراؤں کی دھوپ سہتی اور مسافتوں کی ریت پھانکتی ہیر کو رُوح اور رانجھے کو جسم کی علامت بنایا اسی طرح خواجہ غلام فریدؒ نے فراق میں جلتی اور تھلوں کی خاک چھانتی سسّی کو عشق و محبت اور ہجر و فراق کا استعارہ بنا دیا۔ مجاز کے جھروکوں سے حقیقت کی دلربا کرنوں کو صدا دینا فن شاعری کا ایک اہم سلسلہ ہے اور آگے اس پیرایہ اظہار کو کوئی 'کس معنیٰ' میں لیتا ہے۔ یہ اس کی اپنی نفسیاتی اور ذہنی و فکری پرواز پر منحصر ہے۔ شاعر اپنی بند مُٹھی کی خوشبو کو ہواؤں میں اچھال دیتا ہے۔ آگے ہوا کی مرضی اُسے جہاں چاہے لے جائے۔

ع فکر ہر کس بقدر ہمّت اوست

اور ویسے بھی مجاز کو حقیقت کی سیڑھی قرار دیا جاتا ہے۔ گلشن میں کھِلنے

والے رنگ برنگے پھول اگر مجاز ہیں تو ان کے خوشنما رنگوں اور رُوح افزاء خوشبوؤں سے انھیں پیدا کرنے والا بھی تو یاد آتا ہے۔ سمندر، صحرا، زمین اور آسمان اگر مجاز ہیں تو اُن کی وسعتوں کے افق سے ان کے خالق کی وسعتوں کا تصوّر بھی تو اُبھرتا ہے۔ ماں کی ممتا اور باپ کی محبت و شفقت اگر مجاز ہے تو اس سے ستّر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے اور ان شفّاف جذبوں کو تخلیق کرنے والے کے لطف و کرم کی طرف بھی تو دھیان جاتا ہے۔ انسانی ذات اگر مجاز ہے تو اس کا ظاہری و باطنی حسن و جمال کسی اور حسین کا پتہ بھی تو دیتا ہے۔ جسے دیکھ کر بصارتیں اور بصیرتیں پکار اُٹھتی ہیں کہ

ع وہ مصوّر کیسا ہوگا جس کی یہ تصویر ہے

اور یوں بھی انسان کا مجاز (فانی) سے حقیقت (لافانی) تک رسائی حاصل کرنا منشائے ایزدی بھی تو ہے۔ اس لیے "اولی الالباب" کو تفکر فی الخلق کا حکم بھی دیا گیا اور دستِ قدرت نے مجاز کو اپنے حسن و جمال اور صفاتی جلوؤں کا مظہر بھی بنا دیا۔

صرف انسانی ذات ہی کی مثال لے لیں تو خارجی کائنات یا عالمِ اکبر کی تمام جلوہ سامانیاں جو اُس ذات کا پتہ دیتی ہیں۔ قُدرت نے انہیں ایک انسانی وجود کے اندر جمع کر دیا۔ خارجی کائنات میں اگر بڑے بڑے مضبوط پہاڑ تھے تو انسانی وجود (عالمِ اصغر) میں خدا نے ہڈیوں کو ان پہاڑوں اور چٹانوں کی مضبوطی کی علامت بنا دیا۔ عالمِ اکبر میں جنگلات تھے۔ تو انسانی وجود پر بال پیدا کر کے انہیں ان جنگلات کی علامت بنا دیا۔ چاند کی اٹھائیس منزلیں تھیں تو انسان کے مُنہ میں حروف کے اٹھائیس مخارج رکھ دیئے۔ انسانی پشت کو صحراؤں کی ہموار علامت بنا دیا۔ اسی طرح انسان کے بچپن، جوانی، بڑھاپے،

اور موت کو خارجی کائنات اور عالمِ اکبر میں کارفرما چار موسموں (بہار، گرما، سرما اور خزاں) کا آئینہ دار بنا دیا۔ خارجی کائنات میں اگر ندیاں، نالے اور دریا تھے، تو انسانی وجود میں انتڑیاں، رگیں اور شریانیں پیدا کر کے انھیں ندیوں، نالوں اور دریاؤں کی علامت بنایا۔ خارجی کائنات میں اگر چھم چھم برستی بارش تھی تو انسان کو آنسوؤں کی رم جھم عطا کر دی۔

خارجی کائنات میں اگر چاند اور سورج کی روشنی تھی تو انسان کی آنکھوں کو بصارت کا نور اور دل کو بصیرت کا نور دے دیا۔ خارجی کائنات میں اگر دھوپ اور چھاؤں تھی تو انسانی زندگی کو خوشی اور غم کا مرکب بنا دیا اور جب ساری کائنات کی نشانیوں کو اس ایک وجود میں جمع کر دیا تو فرمایا وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ کہ اے پیکرِ مجاز! تیرے اس وجود کے اندر ہی حقیقتِ کل کا نظارہ بھی موجود ہے اور یہ حقیقتِ کل تیری شہ رگ سے بھی زیادہ تیرے قریب ہے۔ گویا اس نے حقیقت کو مجاز کے اندر مستور کر دیا۔

اسی لیے علامہ اقبال وجدانہ کیفیات میں ڈوب کر پکار اٹھتے ہیں

؎ کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزار سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

اور پھر حقیقتِ منتظر کی طرف سے جواب آتا ہے کہ مری تلاش اور طلب کا دم بھرنے والے!

ع اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی

اور اگر اپنے من میں نہیں ڈوب سکتا تو جا کسی اور پیکرِ محبت کے من میں ڈوب کر سراپا محبت ہو جا، تجھے تیری زندگی کا سُراغ مل جائے گا۔ دُکھی انسانیت سے پیار کر اس کے پیار میں تجھے میرا قرب اور پیار نصیب ہو جائے گا۔

Marfat.com

بقول "پگھل جائیں گی زنجیریں"۔

کسی کے واسطے راہوں میں گرد آلود ہو جانا
سجا کر آئینے تن پہ سنور جانے سے بہتر ہے
اُٹھا لینا کسی کا ایک آنسو اپنے دامن پہ
زر و یاقوت سے دامن کے بھر جانے سے بہتر ہے

محبت کی تخلیق اور "اجزائے ترکیبی" کا ذکر کرتے ہوئے شاعرِ مشرق[7] لکھتے ہیں کہ خالقِ محبت نے اس حسین جذبے کو جب پیدا کرنا چاہا تو

چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغِ جگر مانگا
اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی، حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفسہائے مسیحِ ابنِ مریمؑ سے
ذرا سی پھر ربوبیّت سے شانِ بے نیازی لی
ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیرِ شبنم سے
پھر اِن اجزاء کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی سے
مرکب نے محبّت نام پایا عرشِ اعظم سے

انسانیت کے اعلےٰ مقام تک رسائی کے لیے یہی مرکّب پھر مرکب (سواری) بنتا ہے اور انسان راکب اور پھر بقول شاعرِ مشرق ایک ہی جست سے قصے تمام ہو جاتے ہیں اور زمین و آسمان کی بے کرانیاں سمٹ جاتی ہیں بقول کسے ؎

لازلت انزل من ودک منزلا
تتحیر الالباب عند نزولہ

میں تیری محبت میں اس مقام پہ اتر رہا ہوں جہاں اترنے پہ عقلیں دنگ ہیں

یہی محبّت کبھی خدا بنتی ہے تو کبھی پیکرِ مصطفیٰ[۱۲] میں ڈھلتی ہے. کبھی مشن اور نظریہ بنتی ہے تو کبھی علتوں کی طبیب اور مداوا. کبھی آتشِ سیّال بن کر رگوں میں دوڑتی ہے تو کبھی جلتے ہوئے سینوں پہ شبنمی پھوار بن کر برستی ہے. یہ وہ پاک، مقدّس اور شفّاف جذبہ ہے جو جیون کے بے چراغ رستوں پہ مشعلیں جلاتا اور نور بکھیرتا چلا جاتا ہے. یہ وہ دھنک بکف ہوا ہے جو تاریک جنگلوں سے بھی گزر جائے تو قدم قدم نکہتوں اور رنگوں کے میلے سجا دے. سانسوں کی ڈور سے بندھی ہوئی ہچکیاں اس کی جنوں خیز بارش میں بھیگیں تو پھول بن جائیں. یہ وہ ساز ہے جو تہہ خانۂ غم کے اندر اتر جائے تو اس کی جلترنگ سے زندگی کا رواں رواں رقص کرنے لگ جائے. یہ وہ کہکشاں ہے جو زندگی کی اُجڑی ہوئی مانگ میں افشاں بن کر بکھر جاتی ہے. جب صحراؤں کی طرح رہتے رہتے آنکھیں تھکنے لگتی ہیں تو یہ صبحوں کے گداز منظروں میں لپٹی ہوئی رم جھم کی کھنک لے کر آتی ہے اور چپکے سے سلگتی ہوئی بینائیوں کے اداس اور اُجاڑ روزنوں میں اتار جاتی ہے. یہ آنکھوں کی گاگر میں پانی بھرتی اور ستارے چھلکاتی ہے. یہ جدائیوں کی دھوپ میں تپتی اور سنہری یادوں کی چھاؤں اگلتی ہے. جب تاریکیوں کے فوّارے اُبل کر رُوح کی روشنیوں کو چاٹنے لگتے ہیں تو اس کا سیلابِ تجلّی اندھیروں کو نگلتا ہوا افقِ ذات کے ساحلوں کو بھی پھاند جاتا ہے. تنہائیوں کے ہول نگر جب اپنی وحشتیں لٹانے لگتے ہیں تو محبت نقرئی زمزموں کی ترنّم آبشاروں میں دُھلی ہوئی دھیمی دھیمی سرگوشیاں لے کر آتی ہے اور انھیں گلابوں اور موتیوں کی صورت سماعتوں کے سہمے سہمے آنگن میں دھیرے دھیرے بکھیرنے لگتی ہے. اور جب شام کی پرچھائیاں جلنے لگتی ہیں تو محبت دشتِ بدن پہ چاندنی کی خنک چادر

لپیٹ دیتی ہے۔ یہ پلکوں کے سائے سائے سوتی جاگتی آنکھوں میں خوابوں کی سبز خوشبو انڈیلتی اور دھڑکنوں کے آس پاس پھیلے ہوئے سرد اور منجمد موسموں کی شل ہتھیلیوں پہ حرارتوں کے چراغ جلاتی ہے اور جب وقت قربانی مانگتا ہے تو یہ لہو کا لبادہ پہن کر نکلتی اور راستوں کو لالہ زار بنا دیتی ہے۔ یہ وہ خوشبو ہے جسے کوئی آہنی فصیل نہیں روک سکتی اور نہ کوئی جبر اس کی راہ کی دیوار بن سکتا ہے۔ اس لیے کہ جبر کے چمٹے سے جسم کا کوئلہ تو پکڑا جا سکتا ہے، محبت کا شعلہ نہیں۔

دُکھ اور محبت سفرِ حیات اور انسانی احساسات کے دو ایسے ہم سفر ہیں جو عُمر بھر انسان کے ساتھ ساتھ چلتے بلکہ رواں دواں رہتے ہیں۔ انسان اگر ایک سکہ ہے تو یہ اس سکّے کے دو رُخ ہیں۔ کبھی دُکھ محبت پہ اور کبھی محبّت دُکھوں پہ غالب آجاتی ہے۔ کبھی دونوں ایک توازن کے ساتھ چلتے ہیں۔ اور کبھی دونوں یوں گھل مل جاتے ہیں کہ محبّت ہی دُکھ اور دُکھ ہی محبت ہو جاتے ہیں۔ محبتوں اور دکھوں کی کوکھ سے جنم لینے والے آنسو ایک ہی رُخسار پہ بہتے اور ایک ہی دامن پہ گرتے ہیں۔

دُکھ اگر ردائے بدن پہ زخم کاڑھتے ہیں، تو محبت اُن پہ گلنار شبنم کے موتی بکھیرتی اور سجاتی ہے۔ دکھوں سے کراہتے سانس جب حبس کے ہیولوں میں بھٹکنے اور ہانپنے لگتے ہیں تو محبت اپنی عطر بیز فضاؤں کے پُر کیف جھونکوں کو مشامِ جاں کی نذر کر دیتی ہے۔ دکھوں کے بوجھ سے جب شانے جھکنے لگتے ہیں، تو محبت چُپکے سے ان بوجھل اور دُکھتے ہوئے شانوں پہ دستِ مسیحائی رکھ دیتی ہے اور دُکھ جہاں جینے نہیں دیتے، محبّت وہاں مرنے نہیں دیتی۔ میری شاعری انہی دکھوں اور محبّتوں کے جَلاتے اور جِلاتے لمحوں

کی ڈوبتی، اُبھرتی آوازوں کا ایک سنگم ہے۔ دُکھ کی آواز سے انقلاب کے سوتے پھوٹتے ہیں اور محبت کی آواز سے امن کے۔

میرے محبوب قارئین! میں دکھوں اور محبتوں کے اس سنگم پر آپ کی مہربان آنکھوں اور حسّاس دھڑکنوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ جنہوں نے مجھے محبت سے پڑھنا بھی ہے اور میرے جلتے بجھتے لفظوں کے سُر تال پر دھڑکنا بھی ہے۔

اور انشاءاللہ آئندہ ملاقات "پلکوں پار سمندر" کے بھیگے ساحلوں پر ہو گی۔ تب تک کے لیے

خُدا حافظ!

آپ کا

انوار فریدی

(لاہور)

(Mob.) 0342-255997

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

(برائے پیغام فون: 7320682)

Marfat.com

اللہ

اِک عرض گزاروں اے مولا
اِک روز مجھے مر جانا ہے
یہ دُنیا ایک سرائے ہے
آخر مجھ کو گھر جانا ہے

پر جب تک جان سلامت ہے
ہو وردِ زباں سُبحان اللہ
ہر سانس پُکارے لَآ اِلٰہ
ہر دھڑکن بولے اِلّا اللہ

میں کمتر ہوں، اِک ذرّہ ہوں
تُو ارفع ہے تُو اعلیٰ ہے

تُو میرے ذہن پہ حاوی ہے
تُو میری سوچ سے بالا ہے

سب رنگ ہیں تیری قُدرت کے
ہر چیز کو حُسن میں ڈھالا ہے

اِک بجلی روشن روشن ہے
اِک بادل کالا کالا ہے

مٹّی سے خوشبو پیدا کی
پتھّر سے رزق نکالا ہے

کیڑے سے ریشم بنوایا
اور بیج میں جنگل ڈالا ہے

جو دَھڑکن دَھڑکن جَپتی ہے
وُہ تیرے نام کی مالا ہے

جو آنگن آنگن اُترا ہے
تیرا پُر نُور اُجالا ہے

جو گُلشن گُلشن چمکا ہے
وُہ تیرا رنگ نرالا ہے

جو ساون ساون برسا ہے
تیرا ہی ایک حوالہ ہے

میں تیرا عاصی بندہ ہوں
تو مالک رحمت والا ہے

جند جان امانت ہے تیری
مجھے تو نے ہی تو پالا ہے

اک تیرے ہاتھ نے تھاما ہے
مجھے جب بھی جگ نے ٹالا ہے

اک تیری یاد سہارا ہے
اک تیرا اسم اُجالا ہے

رکھ اُس کے صدقے لاج مری
جو کالی کملی والا ہے

مسکرا کے پیار سے تکتی اُن آنکھوں کو سلام
دِل کی جانب کھلنے والے اُن دریچوں کو سلام

ہو گزر تیرا وہاں تو اے صبا کہنا مرا
کوچۂ محبوب کے پرکیف جھونکوں کو سلام

قریۂ دلدار کی پر نور صبحوں کو دعا
شہرِ جاناں سے گزرنے والی شاموں کو سلام

مفلسوں اور بیکسوں کے چارہ گر کو آفریں
دستگیری کرنے والے اسکے ہاتھوں کو سلام

خیر ہو اس کی نگاہوں سے نکلتے نور کی
اس کے آنگن میں اترنے والے لمحوں کو سلام

Marfat.com

ثبت ہیں جن پر نقوشِ پا نبی کے آج بھی
اُن چمکتے راستوں، اُن رہگذاروں کو سلام

دے رہے ہیں دیدۂ و دل کو جو اَب بھی روشنی
دستِ رحمت کے انہی جلتے چراغوں کو سلام

چومتی ہیں جو سنہری جالیوں کو رات دن
اُن نواؤں اُن پکاروں، اُن صداؤں کو سلام

مرحبا، صد مرحبا انوارِ طیبہ کی فضا
گونجنے والے درودوں اور سلاموں کو سلام

○

اگرچہ دو کناروں کا کہیں سنگم نہیں ہوتا
مگر اِک ساتھ چلنا بھی تو کوئی کم نہیں ہوتا

مداوا آپ ہو جاتے ہیں اپنے درد کا اکثر
وُہ جن زخموں کا دُنیا میں کوئی مرہم نہیں ہوتا

بدن سے رُوح جاتی ہے تو بچھتی ہے صفِ ماتم
مگر کردار مر جائے تو کیوں ماتم نہیں ہوتا

ہزاروں ظلمتوں میں بھی جواں رہتی ہے لَو اسکی
چراغِ عشق جلتا ہے تو پھر مدّھم نہیں ہوتا

وہ آنکھیں اک لُٹا گھر ہیں جہاں آنسو نہیں رہتے
وُہ دل پتھر ہے جس دل میں کسی کا غم نہیں ہوتا

کراہیں اوڑھ کے رہتے ہیں شہرِ جاں کی گلیوں میں
کچھ ایسے درد بھی جن کا کوئی محرم نہیں ہوتا

ریاضت ایڑیاں رگڑے نہ جب تک فن کے صحرا میں
کبھی فن کار کا چشمہ یہاں زمزم نہیں ہوتا

کبھی انوارؔ سناٹوں کو جنگل بھی ترستے ہیں
کبھی شبنم سے پھولوں کا بھی دامن نم نہیں ہوتا

○

رگوں میں گونجتے اشکوں کا ساگر کون دیکھے گا
لہو میں ڈوبتے تاروں کا منظر کون دیکھے گا

دھواں اٹھتا تو شاید کچھ یقیں آتا زمانے کو
پگھلتا یوں مجھے اندر ہی اندر کون دیکھے گا

قیامت اپنے گھر کی آگ پر سارے اٹھا لیں گے
پرایا گھر جلے گا تو پلٹ کر کون دیکھے گا

ستم کرنا ہی ٹھہرا ہے تو کر چاہت کے پردے میں
جو پھولوں میں لپیٹا ہے وہ پتھر کون دیکھے گا

Marfat.com

یہاں تو سنگ مرمر کی چمک پہ لوگ مرتے ہیں
مرے کچّے مکاں تیرا کھلا در کون دیکھے گا

گلے بے خوف ہو کر ہم سے ملیے بزم یاراں میں
چھپا ہے آستیں میں جو وہ خنجر کون دیکھے گا

نگاہیں میرے گرد آلود چہرے پہ ہیں دنیا کی
جو پوشیدہ ہے باطن میں وہ جوہر کون دیکھے گا

تری آنکھوں کی گہرائی میں ڈوبے ہیں تو جانا ہے
کہ جیسا ہم نے دیکھا ہے سمندر کون دیکھے گا

یہاں انوار دھندلائی ہوئی نظروں کی بستی ہیں
تری بھیگی ہوئی پلکوں کی جھالر کون دیکھے گا

○

قدر دُنیا میں نہ جانیں گے زمانے والے
بعد مرنے کے یہاں عُرس منانے والے

کیوں پہنتے ہیں تبسّم کا لبادہ خنجر
کیوں دکھاتے ہیں شہد، زہر پلانے والے

اب تو درکار ہے یاں روز تماشا اِن کو
اَب کہاں لوگ، لگی آگ بجھانے والے

اَب تو خوش ہوتی ہے زخموں کو جگا کر دُنیا
مر گئے پیار کے وہ پھول کھلانے والے

کتنے فنکار ہُوا کرتے ہیں پتھر کھا کر
مُسکراہٹ میں ہر اِک درد چھُپانے والے

تم اُڑو اور کرو تیز ہَوا سے باتیں
اَب تجھے یاد کہاں چال سکھانے والے

صبح ہوتے ہی بدل لیتے ہیں نظریں اُن سے
رات بھر خُون چراغوں کا جلانے والے

پھر مُلاقات کہاں مُلکِ عدم میں ہو گی
اپنی منزل تو بتا جا میرے جانے والے

ہم نہیں ہوں گے تو اے زیست کہاں پاؤ گی
جوڑ کے ہاتھ تجھے رو کے منانے والے

زلزلہ بن کے گزر جاتے ہیں الفؔت! اِک دن
شہر خوابوں کا نگاہوں میں بسانے والے

رکھنا سدا سنبھال کے میری نشانیاں،
دامن میں اشک، رُوح میں باتیں بہانیاں

دُنیا کو انتظار رہی شاید اسی کا تھا
ہم مر گئے تو ہونے لگیں گُل فشانیاں

دیوانگی میں تھام کے بچّے کی قبر کو
اک ماں سُنا رہی ہے ادھوری کہانیاں

اے جبر! سر پھروں کے قبیلے سے دُور رہ
ہم پر نہ چل سکیں گی تری حکمرانیاں

دستورِ عہدِ نو کی جبیں پہ لکھا ہے یہ
رکھیئے عناد، کیجیے گوہر فشانیاں

پتھر اُچھالتے ہیں گلوں میں لپیٹ کر
کرتے ہیں یاریوں بھی کبھی مہربانیاں

غربت میں تشنگی کو بجھانے کے واسطے
غربت ہی پی کے مر گئیں کتنی جوانیاں

اُس نے مرے وجود کو مٹھی میں لے لیا
جگنو کو مل رہی ہیں عجب ضوفشانیاں

بڑھنے لگیں گرانیاں ہر گام پر مگر
ہم نے بھی سر اُٹھا کے ہیں جینے کی ٹھانیاں

روشن یقیں کے نور سے آنگن تھیں کبھی
جن چاہتوں کو چاٹ گئیں بدگمانیاں

○
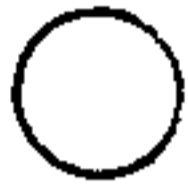
مہکے مہکے منظروں کے ٹوٹتے جادو کا دکھ
باغباں! اب جھیل موسم کی بدلتی خو کا دکھ

دوپہر کے ہاتھ سے کٹتی رہیں کس کی رگیں
سردیوں کی دھوپ کیا سمجھے جھلستی لو کا دکھ

درد کے تاریک رستوں سے لپٹ کے رو پڑا
شامِ غم میں روشنی ہارے ہوئے جگنو کا دکھ

دھیرے دھیرے رات بھر کس آگ میں جلتا رہا
سونے والے جانتے کیا جاگتے آنسو کا دکھ

چشمِ نم میں بھی پگھلتی جا رہی ہیں پتلیاں
دو ہی نقطوں میں سمٹ آیا مِرے ہر سُو کا دکھ

دامنِ دل پر گرا جو اشک تو ایسا لگا
چیخ اٹھا ہو دشت میں جیسے کسی آہُو کا دُکھ

نکہتیں انوارِ خوشبو سے اُڑا کر لے گیا
پت جھڑوں کے خوف سے سہمی ہوئی خوشبو کا دُکھ

میرے نغموں میں نہاں سوزِ صدائے زخم ہے
ہر طرف بکھرا ہوا رنگِ حنائے زخم ہے

اِس طرف اُجڑا ہوا ہے میرے خوابوں کا نگر
اور اُدھر تیری تمنّا، مبتلائے زخم ہے

ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں بے حسی کے دائرے
زندگی! یاں کون تیرا آشنائے زخم ہے

Marfat.com

پرسشِ احوال پر آنسو چھلکتے تھے کبھی
مُسکرا دیتا ہُوں اب یہ انتہائے زخم ہے

کم لگا ہوں میں اُجالے بانٹنے کا ہے صلہ
آج ہاتھوں میں چراغوں کی بجائے زخم ہے

شہر کی اِن اُلجھی اُلجھی بولیوں کی بھیڑ میں
اِک ترا لہجہ ہے جو وجہِ شفائے زخم ہے

سوچتا ہُوں کیسے دکھلاؤں اُسے اپنا لہُو؛
جسم پہ انوارؔ اُس کے بھی قبائے زخم ہے

○

جی چاہتا ہے غم کے قصے سُنا سُنا کر
آنسو ترے سمیٹوں تجھ کو رُلا رُلا کر

اِک ہاتھ چُنتے چُنتے کانٹے لہو میں تر ہے
اِک ہاتھ جل گیا ہے شمعیں جلا جلا کر

پھینکا ہے مجھ کو لا کے دریا میں تشنگی نے
مارے گا اَب یہ دریا، پانی پلا پلا کر

کرنا ہی طنز ہے تو ہنسنے کا کیا تکلّف؟
کیوں زہر دے رہے ہو زمزم مِلا مِلا کر

تو بھی اُٹھا فصیلیں لیکن یہ یاد رکھنا
بڑھتی ہیں چاہتیں بھی رستے بنا بنا کر

قد چھیننے میں سورج ناکام ہو گیا تو
بہلا رہا ہے خود کو سائے گھٹا گھٹا کر

تنہائی سے لپٹ کے اِک بار کھل کے رو لو
کب تک جیو گے آخر آنسو چھپا چھپا کر

دیوار و در رہے ہیں ویراں بغیر تیرے
دیکھا ہزار ہم نے گھر کو سجا سجا کر

کیسے یہ راہبر ہیں انوار! رہروؤں کو
منزل دکھا رہے ہیں آنکھیں بجھا بجھا کر

○

شہرِ ستمگراں میں سہارا ہے تیرا نام
کربِ ہجومِ غم میں دلاسا ہے تیرا نام

گزرے سماعتوں سے تو مہکے حریمِ جاں
خوشبو بھری بہار کا جھونکا ہے تیرا نام

رگ رگ میں بج اٹھا ہے کوئی جلترنگ سا
دھیرے سے کس نے کان میں بولا ہے تیرا نام

دیکھوں تو چند حرف، اگر ڈوب جاؤں تو
ساتوں سمندروں سے بھی گہرا ہے تیرا نام

راحت، بہار، چاندنی، خوشبو، دھنک، صبا
یکجا کریں جو سب کو تو بنتا ہے تیرا نام

شہنائیاں ہیں دھڑکنیں، بارات چاہتیں
دلہن ہے روح میری تو دولہا ہے تیرا نام

Marfat.com

ناؤ مرا وجود ، ہوا ہے ترا خیال
دریا ہے درد اور کنارا ہے تیرا نام

روشن ہے صبح ، اس سے بھی روشن ہے تیری ذات
اُجلی ہے دھوپ ، دھوپ سے اُجلا ہے تیرا نام

دیتا ہے میرا دل اُسے بے ساختہ دُعا
جب کوئی شخص پیار سے لیتا ہے تیرا نام

لگتا ہے جیسے رقص میں سب کائنات ہے
جب بھی مری زبان پہ آتا ہے تیرا نام

کانٹے ملا کے مَیں نے بنایا ہے اپنا دل
اُس پر گلوں کو جوڑ کے لکھا ہے تیرا نام

ہر ہر قدم پہ ساتھ ہے انورؔ کے سَدا
ہر سانس کے سفر کا اثاثہ ہے تیرا نام

ہاتھ پھیلے ہیں کسی دشت کے دامن کی طرح
ابر میں ڈھل کے برس جا کبھی ساون کی طرح

بال کھولے ہوئے روتی ہے مری تنہائی
ایک اجڑی ہوئی بے خواب سہاگن کی طرح

چند لمحات نہیں، عمر گزاری میں نے
جسم سے روح کے ٹوٹے ہوئے بندھن کی طرح

قافلے یاد کے ڈھونڈیں گے مگر میں اِک دن
وقت کی بھیڑ میں کھو جاؤں گا بچپن کی طرح

آہٹیں دل پہ اُتر آتی ہیں دستک بن کر
سینۂ شب میں دھڑکتا ہے تُو دھڑکن کی طرح

آشیاں آج اگر زد میں ہے انور! تو کیا
زد میں حالات بھی آئیں گے نشیمن کی طرح

شہرِ خموشاں

مری غزلیں ہیں وہ شہرِ خموشاں
جہاں بنتی ہیں قبریں کاغذوں کی
ہوائے غم اٹھا لاتی ہے جس میں
کفن لفظوں کے لاشیں آنسوؤں کی

روح میں چھوڑ کے بھونچال گزر جاتا ہے
یوں مری عمر کا ہر سال گزر جاتا ہے

آنکھ بُنتی ہے ہر اک شب کو نیا اک سپنا
دن مگر چل کے نئی چال گزر جاتا ہے

زندگی! میں ترے بازار سے گزرا جیسے
ہاتھ مَلتا ہوا کنگال گزر جاتا ہے

جو مرے حالِ پریشاں پہ تڑپ اُٹھتا تھا
اب وہی دیکھ کے احوال گزر جاتا ہے

چیرنے آتا ہے پربت کا جگر جو رہبر
کھود کے راہ میں پاتال گزر جاتا ہے

رسیاں کاٹنے آتا ہے جو اوتار! وہی
پھینک کر ایک نیا جال گزر جاتا ہے

○

کیا ضروری ہے کہ بے جان ہوں سارے پتھر
میں نے سینوں میں دھڑکتے ہوئے دیکھے پتھر

سوچنا! کس نے ہمیں سنگ صفت کر ڈالا
آئینہ ہوتے جو تم، ہم بھی نہ ہوتے پتھر

مشکلیں اشک بہانے سے نہ آساں ہوں گی
زورِ دریا نہ کبھی ابر سے پگھلے پتھر

عہدِ خوشحال میں جس سمت سے پھول آتے تھے
وقت بدلا تو اسی سمت سے آئے پتھر

آگ لفظوں کے تصادم سے بھڑک اُٹھی ہے
جیسے ٹکرا کے اُگلتے ہیں شرارے پتھّر

زخم بھی اِن کے مہک اُٹھتے ہیں خوشبو بن کر
پھول لگتے ہیں مجھے راہِ وفا کے پتھّر

جانے کس کس پہ پڑی ہوں گی تمھاری نظریں
مَیں نے چُن چُن کے ترے شہر کے چُومے پتھّر

اپنی دستار بچاؤں کہ سنبھالوں خود کو
سَر پہ طوفان ہیں اور پاؤں کے نیچے پتھّر

○

کچھ آنسو کچھ زخم چھپائے پھرتے ہیں
ہم بھی کیا کیا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں

اپنے اپنے بوجھل بوجھل کاندھوں پر
اپنی اپنی لاش اٹھائے پھرتے ہیں

لرزاں ہیں کس خوف سے جاں کی دیواریں
بستی بستی ہم گھبرائے پھرتے ہیں

برف جمی ہے ہونٹوں پر سناٹوں کی
سوچوں میں طوفان بسائے پھرتے ہیں

Marfat.com

چیخوں کے انبار میں ہم شہنائی کی
دل کو جھوٹی آس دلائے پھرتے ہیں

تعبیروں کی اجڑی اجڑی آنکھوں میں
سپنوں کی تصویر سجائے پھرتے ہیں

پگھلاتی رہتی ہے پل پل یاد وہی
ہم جس یاد کے اوڑھ کے سائے پھرتے ہیں

کوئی ہم کو بھول گیا تو شکوہ کیا
ہم خود اپنا آپ بھلائے پھرتے ہیں

کیسے ہو انوارؔ! اجالا آنکھوں میں
خوابوں کے سورج گہنائے پھرتے ہیں

○

درد کی راکھ سے اٹے آنسو
اب تو خوابوں سے بڑھ گئے آنسو

عمر بھر روشنی رہی گھر میں
خواب ٹوٹے تو جل اُٹھے آنسو

سب نے روشن کئے چراغ اپنے
مَیں نے دیوار پہ دھرے آنسو

تُو نہ آیا تو تیری حسرت میں
گر کے پلکوں سے مر گئے آنسو

Marfat.com

کچھ نہ کہنا بھی کہہ گیا سب کچھ
سِل گئے لب تو بول اُٹھے آنسو

جن پہ ہم نے گلاب چھڑکے تھے
ہائے وُہ لوگ دے گئے آنسو

لوگ اُگاتے ہیں رات کی رانی
مَیں نے آنگن میں بو دیئے آنسو

منتظر ہیں کسی کی آہٹ کے
شب کی پلکوں پہ جاگتے آنسو

بات کر، چھیڑ داستاں کوئی
اے مرے ہم سفر! مرے آنسو

رنگ بھرنے چلا تھا جیون میں
اور دامن میں بھر لیئے آنسو

Marfat.com

کِس نے دیکھے ہیں میری آنکھوں میں
ڈُوبتے خواب، تیرتے آنسُو

آج بھی پتھروں میں تُلتے ہیں
کیا ترے اور کیا مرے آنسُو

مُسکرانے کو لب ہلاتے تھے
اور آنکھوں میں آ گئے آنسُو

تُو کبھی مجھ کو حوصلہ دیتا
مَیں کبھی پُونچھتا ترے آنسُو

چھین کر خواب کتنی پلکوں میں
زندگی نے پرو دیئے آنسُو

پھُول دیکھوں تو یاد آتے ہیں
اُس کے رُخسار پہ ڈھلے آنسُو

موسم وصل میں جو بوئے تھے
موسم ہجر میں اُگے آنسو

اور کتنا ہے فاصلہ باقی؛
پُوچھتے ہیں یہ ہانپتے آنسو

چہرہ ایسی کتاب ہے جس میں
دستِ قدرت نے لکھ دیئے آنسو

کھو گئے رتجگوں کے جنگل میں
ڈھونڈتے ڈھونڈتے تجھے آنسو

کوئی دُکھ تھا نہ تھی خوشی کوئی
بے سبب آج بہہ گئے آنسو

درد آ، گنگنا غزل میری
میں نے لفظوں میں بھر دیئے آنسو

خواب کی جڑ میں آب زر ڈالا
خواب کی شاخ پر کھلے آنسو

تکتے رہتے ہیں گھر کی ویرانی
میری پلکوں کی اوٹ سے آنسو

ڈھل چکی رات اے غمِ ہجراں!
تو بھی سو جا، کہ سو گئے آنسو

ضبط حد سے گزر گیا جب بھی
توڑ کر بند، بہہ گئے آنسو

کہکشاں بن گئی ہنسی تیری
خاک میں مل گئے مرے آنسو

کیا بجھائیں گے تشنگی میری
پیاس کی آگ پھانکتے آنسو

دامنِ گل پہ صورتِ شبنم
رات کی آنکھ سے گرے آنسو

پاس آئے تو ڈوب جاؤ گے
دور سے دیکھنا مرے آنسو

وقتِ افطار یوں گزارا ہے
کھا لیے زخم پی لیے آنسو

دھوپ چھاؤں کا سفر

سُکھ کی چھاؤں اور دُکھ کی دھوپ میں
قافلہ رہتا ہے سانسوں کا رواں

چند لمحوں کے لیے آتا ہے پھر
رُخ بدل لیتا ہے خوشیوں کا سماں

چھوڑ جاتی ہیں اچانک راحتیں
آدمی کو وحشتوں کے درمیاں

کچھ قدم رہتا ہے سایہ ہم سفر
سر سے اُڑ جاتا ہے پھر ہر سائباں

Marfat.com

دُور تک جاتا ہے صحرا دھُوپ کا
ہم قدم رہتی ہیں غم کی آندھیاں

عید کا بس ایک دن ہے سال میں
اور ہے دس دن محرّم کی فغاں

بجلیوں کی مُسکراہٹ ایک پَل
اَبر روتا ہے مگر پہروں یہاں

مختصر ہوتے ہیں قصّے طرَب کے
کرب کی ہوتی ہے لمبی داستاں

جلتی بجھتی رَہگُذر ہے زندگی
دھُوپ چھاؤں کا سفر ہے زندگی

○

دشت میں سائے کی ضد، مت اے دلِ نادان! کر
چل غموں کی دُھوپ میں زخموں کی چادر تان کر

کرچیاں بکھرے ہوئے خوابوں کی پلکوں پر سجا
درد کے مضموں کا پیدا نیا عنوان ــــ کر

لب جلا ڈالے سرابوں کی جھلستی ریت نے
تشنگی لپکی جہاں پانی کا چشمہ جان کر

Marfat.com

چاٹ اب ظلمت، تجھے کس نے کہا تھا بے خبر
جگنوؤں کی آس میں گھر کے دیئے ویران کر

ٹھوکریں کھا کے پلٹ آنے میں دشواری نہ ہو
جانے والے جا مگر سب راستے پہچان کر

آرہی ہے ایک ان دیکھے نگر سے یہ صدا
زندگی! اگلے سفر کا بھی کوئی سامان کر

خواہشیں انوار! ہیں مرگِ صدا سے آشنا
چیخ اور خاموش جنگل اور بھی سنسان کر

○

برس رہے ہیں سحاب تیرے
نظر میں رم جھم ہیں خواب تیرے

سحر ہے یا کوئی دھیرے دھیرے
الٹ رہا ہے نقاب تیرے

چراغ، سورج، کرن، ستارا
غزل میں سارے خطاب تیرے

کچھ ایسے دکھ سکھ کو بانٹ لیں آ
عذاب میرے، گلاب تیرے

میں آگ پہنوں، تو لہر اوڑھے
یہ دشت میرے، چناب تیرے

وہ بکھرے بکھرے سوال میرے
وہ مہکے مہکے جواب تیرے

وفا، محبّت، جمال، لہجہ
رہیں سلامت شباب تیرے

بڑھیں گے انوار جلتے آنسو
یہ حرف حرف اضطراب تیرے

○

خدا کرے کہ سلامت رہے مرا گلشن
چھپے ہوئے ہیں درختوں کی اوٹ میں دشمن

رُتوں کے جبر کا مارا لہو اُگلتا ہے
گلوں کے شہر میں یہ خاک پھانکتا جیون

کہاں ہے تُو مرے آنسو سمیٹنے والے
ترے بغیر یہ کتنے گزر گئے ساون

ہُوا ہے دل جو شکستہ تو یہ عجب کیا ہے
کہ ایک دن تو بکھرنا تھا کانچ کا برتن

تُو آپ آئے تو عالم ہی اور ہو گھر کا
فقط خیال سے تیرے مہک اُٹھا آنگن

کہاں تھا رات کے پھیلے ہوئے اندھیرے میں
ہوئی جو صبح تو سورج بھی ہو گیا روشن

زمیں سحر کے اُجالے سمیٹ کر خوش ہے
فلک پہ کتنے ستاروں کا لُٹ گیا جوبن

کبھی جو وقت کی گلیوں میں چھوڑ آئے تھے
پلٹ رہا ہے بڑھاپے میں پھر وُہی بچپن

وُہ حبسِ ذات کا آزار یُوں مداوا ہے
ہو جیسے قبر کے زِنداں میں خُلد کا روزن

○

بیٹھ کر حالات کے زنداں میں رونے کے لیے
زندگی! میں نے تجھے پایا تھا کھونے کے لیے

اب نہیں فرصت اُٹھاؤں اپنا لاشہ دوش پہ
جی رہا ہُوں دُوسروں کا بوجھ ڈھونے کے لیے

ابرِ باراں، اشک، شبنم سب گریزاں ہیں تو کیا؟
ہے بہت خُونِ تمنّا زخم دھونے کے لیے

کر گئی ہے خُشک، آنکھوں کو تپش حالات کی
چند آنسُو بھیج دے، پلکیں بھگونے کے لیے

Marfat.com

ڈوبنے کے واسطے دریا ضروری تو نہیں
تشنگی کافی ہے میرے غرق ہونے کے لیے

سامنے آئیں تو ہنس ہنس کر گلے ملتے ہیں جو
تاک میں ہیں پشت کی خنجر چبھونے کے لیے

پوچھتے ہو کیا متاعِ اہلِ غم اس شہر میں
پھانکنے کو خاک ہے فٹ پاتھ سونے کے لیے

ڈال کر دامن میں میرے چل دیا انوارؔ! وہ
کچھ گہر آہوں کے سانسوں میں پرونے کے لیے

Marfat.com

دراڑیں

دیکھ کر بیٹے کا لاشہ سامنے
برچھیاں آنکھوں میں جیسے گڑ گئیں
چیخ ماری ماں نے رکھ کے دل پہ ہاتھ
آسماں میں بھی دراڑیں پڑ گئیں

"ہر شہر میں جنگل پھیل گیا"

کس صبح کا سپنا دیکھا تھا
کس شام کا آنچل پھیل گیا
ہر موڑ پہ وحشت گونج اُٹھی
ہر شہر میں جنگل پھیل گیا

اک بستی کے حالات نہیں
اک دو قریوں کی بات نہیں
ہر نگری میں، ہر گلشن میں
ہر مسکن میں، ہر آنگن میں
صحراؤں میں، کہساروں میں
ان گلیوں میں، بازاروں میں

ہر خواب کو ظلمت چاٹ گئی
ہر آنکھ میں کاجل پھیل گیا
ہر موڑ پہ وحشت گونج اُٹھی
ہر شہر میں جنگل پھیل گیا

یہ کیسی چھینا جھپٹی ہے
یہ کیسی مارا ماری ہے
یہ کیسا شور شرابہ ہے
یہ کیسا خون خرابہ ہے
چنگھاڑ یہ کیسی آتی ہے
جو دہشت بن کر چھاتی ہے
یوں نکلا غول درندوں کا
ہر جانب جنگل پھیل گیا
ہر موڑ پہ وحشت گونج اُٹھی
ہر شہر میں جنگل پھیل گیا

ہر سمت صلیبیں بوتے ہیں
خود چین سے ظالم سوتے ہیں
کھلتے ہی آنکھیں پھوٹ گئیں
سب آس اُمیدیں ٹوٹ گئیں
کیا سوچا تھا کیا دیکھا ہے
ہر سانس لہو کی ریکھا ہے
انسان کا سینہ چاک ہُوا
اور مقتل مقتل پھیل گیا
ہر موڑ پہ وحشت گونج اُٹھی
ہر شہر میں جنگل پھیل گیا

یہ کیسی آگ کی دُھونی ہے
کیوں منظر خونی خونی ہے
کیوں رستہ رستہ جلتا ہے
کیوں آس کا سورج ڈھلتا ہے
پُر نور سحر کب پھوٹے گی ؟
زنجیرِ ستم کب ٹوٹے گی ؟

اب رحم و کرم فرما مولا !
دُکھ درد کا بادل پھیل گیا !
ہر موڑ پہ وحشت گونج اُٹھی
ہر شہر میں جنگل پھیل گیا

Marfat.com

○

زرد رُتوں میں ہم نے سوچوں کو بہلانا سیکھ لیا ہے
تنہائی کے بنجر بن میں خواب اُگانا سیکھ لیا ہے

روشن کرتے رہنا اَشکوں سے بے نور چراغوں کو
پھر اِک جھونکا بن کے سارے دیپ بجھانا سیکھ لیا ہے

کون بتائے آخر کس کو، کس نے، کتنا لُوٹا ہے؟
بستی بستی چوروں نے بھی شور مچانا سیکھ لیا ہے

چاٹ لیئے ہیں جوبن سارے رنگ اُڑاتی دھوپنے یُوں
اب تو کاغذ کے پھولوں نے بھی مُرجھانا سیکھ لیا ہے

Marfat.com

کس کے شیریں لہجے کی اب بات کریں کہ لوگوں نے
میٹھی میٹھی باتوں میں بھی زہر پلانا سیکھ لیا ہے

جلتے بجھتے موسم ہوں یا کیسی رت ہو ہم نے بھی
اس کی خوشبو سے گھر بیٹھے گھر مہکانا سیکھ لیا ہے

اب تو اکثر سینے سے آنورؔ یہ باہر رہتا ہے
جب سے دل نے اس نگری میں آنا جانا سیکھ لیا ہے

○

میرے پاؤں میں وُہی غم کا بھنور ہے آج بھی
خواب اُجڑے ہیں مرے ویراں نظر ہے آج بھی

آج بھی لپٹی ہُوئی ہیں تن بدن سے وحشتیں
رات سے تاریک اپنی رہگذر ہے آج بھی

ایک سایہ تھا مرے ہمراہ، وُہ بھی چھن گیا
یُوں سرِ صحرائے شب تنہا سفر ہے آج بھی

جاگتے رہتے تھے خُوں پہلے بھی سنّاٹے مرا،
آج بھی پتھر ہیں لب، سُنسان گھر ہے آج بھی

کس نے پھینکا تھا کماں میں رکھ کے شعلہ سا کوئی
رُوح میں اُس کی حرارت کا اثر ہے آج بھی

عظمتِ انسان کا معیار کل بھی زر ہی تھا
عظمتِ انسان کا معیار، زر ہے آج بھی

بے نیازانہ وُہ جن راہوں سے گزرے تھے کبھی
اُن حسیں راہوں پہ میرا خم یہ سر ہے آج بھی

کب سے وُہ گلیاں مری چہکار سے محرُوم ہیں
منتظر میرا وُہ گاؤں کا شجر ہے آج بھی

اِک جھلک دیکھے ہُوئے جس کی زمانہ ہو گیا
اُس کے چہرے کی نگاہوں میں سحر ہے آج بھی

○

نہ لب پہ شکوہ نہ دل میں شکایتیں رکھنا
کثافتوں سے بچا کر محبتیں رکھنا

رہے یہ درد بدن کے غلاف میں لپٹا
چھپا کے روح میں غم کی عنایتیں رکھنا

ہے گل سے پیار کا دعویٰ تو نامناسب ہے
اُسی کی شاخ کے کانٹوں سے نفرتیں رکھنا

بکھر نہ جائیں یہ شہرِ وفا کی دلداریں
حدودِ عشق سے باہر سیاستیں رکھنا

گڑی ہیں رہ میں صلیبیں اگر مسافت کی
سجا کے طاقِ تصور میں قربتیں رکھنا

Marfat.com

یہ کیسا دور ہے یارب کہ شر کی بستی ہیں
عذابِ جاں ہے ہمارا شرافتیں رکھنا

ستم زدوں کو یہ حالات خود سکھاتے ہیں
دِلوں میں آگ، سروں میں بغاوتیں رکھنا

بجھے بجھے سے چراغوں کو دیکھتے کیا ہو؟
کہا تھا کس نے ہواؤں سے اُلفتیں رکھنا

مجھے کسی سے نہیں کچھ گلہ زمانے میں
بس ایک تو نہ زمانے سی عادتیں رکھنا

میں ایک شب کا مُسافر ہوں جاگتے لمحو!
نہ پیار کرنا، نہ مجھ سے عداوتیں رکھنا

یہ درد و سوز، یہ انور! غم کی سوغاتیں
بہت سنبھال کے اُس کی امانتیں رکھنا

Marfat.com

شہکار

اگر چشمِ تصوّر میں
تجھے دیکھوں، تجھے سوچوں
تو لگتا ہے کہ جیسے میری پلکوں کے دریچوں میں
دھنک سی آن اُتری ہو

کبھی چشمِ تصوّر میں
جو تجھ سے بات کرتا ہوں
تو ٹھہرا لگتا ہے
مجھے ہر پل، ہر اک لمحہ
میں ان لمحوں کے جھرمٹ میں
تری باتوں، ترے لفظوں کے موتی چُنتا رہتا ہوں

تو پھر اِن موتیوں سے
کہکشاں میں بُنتا رہتا ہوں

نہیں یہ بات کچھ پل کی
دِنوں کی ہے نہ برسوں کی
کہ تیری رُوح سے میرا کئی صدیوں کا رشتہ ہے
بتا مجھ کو
مری اس رُوح کی بے چین وادی میں
تو کس نگری سے آیا ہے؟
بتا؛ یہ کیا کرشمہ ہے؛
یہ کیسا تیرا جادُو ہے؛

ہنسے جو تو
تو تیرے ساتھ کلیاں کیوں چٹکتی ہیں؟
دھڑکتا ہے جو دل تیرا
تو تیرے دل سے میری دھڑکنیں بھی کیوں دھڑکتی ہیں!
جہاں سے تو گزر جائے
وہ راہیں دیر تک تیری مہک سے کیوں مہکتی ہیں؛

ہوائیں
تجھ کو چھُو لیں تو
بتا، بے رنگ ولبو رستوں پہ افشاں کیوں چھڑکتی ہیں؛

تو یاد آئے

تو تیری یاد کی گلنار ٹہنی پہ
بتا کیوں میری افسردہ تمنائیں چہکتی ہیں؛
میں جاگوں تو شب غم میں
تمہاری آرزو کی ان گنت پرچھائیاں آکر
مجھے باہوں میں لے کے کیوں محبت سے تھپکتی ہیں؛
کبھی چشم تصور میں
پریشاں تجھ کو دیکھوں تو
بتا کیوں میری آنکھیں بھی ترے غم میں چھلکتی ہیں؛

اگرچہ عالم ہو ہے
مگر تو میرے ہر سو ہے
دھنک ہے تو کہ خوشبو ہے
تو تارا ہے کہ جگنو ہے
بتا مجھ کو کہ کیا تو ہے
یہ کیسا تیرا جادو ہے!

تو بولے تو
بہاریں دھیرے دھیرے مسکراتی ہیں

تو رُوٹھے تو
گلابوں کی رُتیں تجھ کو مناتی ہیں
تو چل دے تو
ہزاروں رنگ دھرتی پر بکھرتے ہیں
تو تک لے تو
ستارے حجلۂ جاں میں اُترتے ہیں
تو ایسا دلرُبا ہے
تو وہ شہکارِ مشیّت ہے

کہ قدرت نے ہوا سے نرمیاں لیں ، ابر سے بُوندیں
مہک لی کھلتی کلیوں سے ، ترنّم آبشاروں سے
دھنک سے رنگ ، پھولوں سے تبسّم ، نغمہ کوئل سے
تمازت دھوپ سے ، شبنم سے ٹھنڈک ضو ستاروں سے

ملا کے حُسنِ عالم کو تجھے رب نے بنایا ہے
بنا کے پھر مری یادوں کے آنگن میں بسایا ہے

Marfat.com

○

پلکوں پہ ہر اک اشک پرو یا نہیں جاتا
آنکھوں سے ہر اک زخم کو دیکھا نہیں جاتا

یہ کام تو لہجے سے بھی لے لیتی ہے دُنیا
ہر سنگ کو ہاتھوں سے اُچھالا نہیں جاتا

لہریں بھی چلیں ساتھ ضروری تو نہیں ہے
ہر ناؤ کے ہمراہ تو دریا نہیں جاتا

تعبیر اگر اس کے مقدّر میں نہیں ہے
کیوں چھوڑ کے پھر آنکھ کو سپنا نہیں جاتا

جس یاد سے زندہ ہوں اُسے کیسے بھلا دوں
خود سانس کی ڈوری کو تو کاٹا نہیں جاتا

رُک جاتی ہے ہر سوچ درِ یار پہ جا کر
اُس در سے پرے کوئی بھی رستہ نہیں جاتا

اُس موڑ سے ہو جاتا ہے آغاز جنوں کا
انجام جہاں عشق کا سوچا نہیں جاتا

ہمّت ہے تو پھر کھینچ لو سورج کی طنابیں
ڈھلتے ہوئے سائے کو تو روکا نہیں جاتا

اُترو بھی مرے اشک سمندر میں کسی دن
ساحل سے تو گہرائی کو ناپا نہیں جاتا

رہتا ہے مرے ساتھ رواں دھوپ نگر میں
سر سے تری دیوار کا سایا نہیں جاتا

کیوں ظلم کے انوار! پگھلتے نہیں پتھر
کیوں جبر کا نسلوں پہ اجارا نہیں جاتا

Marfat.com

اوقات

دن رات کی گردش برحق ہے دن رات بدلتے رہتے ہیں
حالات پہ کیوں حیرت ہو مجھے حالات بدلتے رہتے ہیں
موسم بھی رنگ بدلتا ہے کیا شکوہ موسم سے لیکن
افسوس ہے اُن پر جو اپنی اوقات بدلتے رہتے ہیں

○

تنہائی میں سرگم گھولو!
یادو! چپ کے بندھن کھولو

عشق ستارہ، عشق سمندر
کرنیں پالو، دامن دھولو

محفل محفل زخم سمیٹو
تنہائی میں جا کے رولو

جاہل جاہل کہلاؤ گے
اتنا بڑھ چڑھ کے مت بولو

یا منزل کی آس نہ رکھو
یا رستوں کے پیچ نہ ڈولو

خود بھی زخمی ہو جاؤ گے
مت اوروں کے زخم ٹٹولو

ہم پر تہمت بھی دھر لینا
پہلے اپنے داغ تو دھولو

عزّت کا معیار یہی ہے
قد ناپو، دستار کو تولو

نیندوں کی خیرات کہاں اب
جلتی آنکھوں کے کشکولو!

آنسو موتی، آنسو گوہر
مٹّی میں انوار! نہ رولو

Marfat.com

○

برس جاتا ہے جس کو دیکھ کے ساون شراروں میں
وہ ایسا شخص کوئی ایک ہوتا ہے ہزاروں میں

ترنم قہقہوں کی آبشاروں کا بجا لیکن
مزا کچھ اور ہی ہے بیٹھنے کا غم کے ماروں میں

یہ کس بے درد کی عزت کا لاشہ آ گرا ہم میں
یہ کس نے طنز کا پھینکا ہے پتھر اشکباروں میں

گہر چاہت کے پاؤ گے نہ رنگوں کے سمندر میں
ملیں گے تم کو یہ انمول موتی خاکساروں میں

سُنائی دے رہی ہے بازگشت اُس کی مجھے اب بھی
کہ جیسے گونجتی ہو اِک صدا سی کوہساروں میں

مری خوشیوں کے رہزن ہی مری خوشیوں میں شامل تھے
ملے گا میرا قاتل تم کو میرے سوگواروں میں

اُسے خوشبو بھرے جھونکوں سے بھی تکلیف ہوتی ہے
جلا ہو جس کا آشیاں دھیرے دھیرے بہاروں میں

چھلک جاتا ہے غم انوار! آنسو بن کے آنکھوں سے
کہ یہ دریا نہیں رہتا کبھی اپنے کناروں میں

Marfat.com

○

کُچھ کم نہیں تھیں دن کی دہکتی اذیّتیں
ہمراہ لے کے آئی ہے شب بھی اذیّتیں

تشنہ لبی نے نیند کے جنگل جلا دیئے
کب تک لہُو پئیں گی یہ پیاسی اذیّتیں

ہنسنے کی عمر میں نے تڑپ کر گزار دی
آدھے سفر میں کاٹ لیں پوری اذیّتیں

یارب! لہُو اُگلنے لگی زندگی مری
اب تو کوئی سمیٹ لے میری اذیّتیں

سہہ سہہ کے کرب کاٹ لیا جب کوئی سفر
تھیں سامنے اِک اور سفر کی اذیتیں

اب تو ہر ایک موڑ پہ پانی کی بوند سے
سستا ہے خون، خون سے سستی اذیتیں

گزرا نہ ہو جو خود کسی آزار سے، وہ دل
محسوس کیا کرے گا کسی کی اذیتیں

خوشیاں مرے نصیب کی دے دے تجھے خدا
دامن میں میرے ڈال دے تیری اذیتیں

انوارؔ بھول جاتے ہیں مجھ کو یہ غم مرے
پھرتی ہیں جب نگاہ میں اس کی اذیتیں

○

در کھلنے کا عکس نظر میں رہتا ہے
سوچیں گھر میں جسم سفر میں رہتا ہے

پل پل ہے اک دھڑکا رد نہ ہو جانے کا
دل لمحوں کی راہگذر میں رہتا ہے

جڑ کا خون پلانا کوئی دیکھے کیا
یاں تو سب کا دھیان ثمر میں رہتا ہے

عمر گھٹی ہے سانس کے ہر ہر چکر میں
لگتا ہے انسان صفر میں رہتا ہے

Marfat.com

تنہائی کا ہو یا ہو خدشوں وہموں کا
اک نہ اک آسیب تو گھر میں رہتا ہے

ربط اچانک توڑنے والے سوچ ذرا
کچھ تو شب کا رنگ سحر میں رہتا ہے

ہلکی ہلکی آنچ میں جلتا رہتا ہوں
میٹھا میٹھا درد جگر میں رہتا ہے

میں اک جلتے درد نگر کا باسی ہوں
تو بتلا کس روپ نگر میں رہتا ہے

دیتا ہے انور! دعائیں ساحل کی
مجھ کو جو اک شخص بھنور میں رہتا ہے

Marfat.com

○

بکھرتی سوچوں میں گم سدا محوِ یاس رہنا ہری رُتوں میں
کہاں سے سیکھا ہے تُو نے اے دل! اُداس رہنا ہری رُتوں میں

بہار آئی مگر نہ لائی وہ میرے خوابوں کے سبز پتے
غضب ہے شاخِ شجر کا یُوں بے لباس رہنا ہری رُتوں میں

تجھے نہ پاکر کہیں پلٹ ہی نہ جائیں خوشبو بھری ہوائیں
مجھے اکیلا نہ چھوڑنا، میرے پاس رہنا ہری رُتوں میں

خزاں کے ہاتھوں جو پیڑ اُجڑے دکھائی دیتا ہے سب کو لیکن
بہت کٹھن ہے نگاہ کا غم شناس رہنا ہری رُتوں میں

مجھے بھی لینے دے سانس، تو بھی سکون لے دُکھ کے زرد سائے
نہیں مناسب ترا محیطِ حواس رہنا ہری رُتوں میں

ہیں سانپ اب بھی چنبیلیوں میں ہیں اب بھی سہمے ہوئے نشیمن
چمن کو کب تک ہے یُوں ہی وقفِ ہراس رہنا ہری رُتوں میں

گلاب لفظوں سے رنگ بھرنا، اُداس لمحوں کی پتیوں میں
نظر کے پھیکے ثمر کی بن کے مٹھاس رہنا ہری رُتوں میں

Marfat.com

○

کچھ منظر ایسے ہوتے ہیں
ہر آن جو سوچوں یادوں کے
رُومال میں لپٹے رہتے ہیں
جو آنکھ سے اوجھل رہ کر بھی
احساس کے کورے کاغذ پہ
کچھ رنگ سے بھرتے رہتے ہیں
جب لمحے چُپ ہو جاتے ہیں
وُہ باتیں کرتے رہتے ہیں

کچھ سپنے ایسے ہوتے ہیں
جو چپکے چپکے پلکوں کے
اس پار مچلتے رہتے ہیں
جب زرد ہوائیں چلتی ہیں
جب درد دریچے کھلتے ہیں
جب خواب نگر جل جاتے ہیں
وہ اشکوں میں ڈھل جاتے ہیں

کچھ پتھر ایسے ہوتے ہیں
جو لمحہ لمحہ سینے میں
بیکار دھڑکتے رہتے ہیں
انفاس کی جلتی شمعوں پہ
ظلمات چھڑکتے رہتے ہیں
جو چاہت سے کتراتے ہیں
اور پھر بھی دل کہلاتے ہیں

تیرے پلٹ جانے کا غم

لمحہ لمحہ جل رہا ہو جو جھلستی دھوپ میں
پُوچھنا اس دشت سے بادل کے چھٹ جانے کا غم
زندہ کر جاتی ہے ہم کو تیرے آنے کی خوشی
مار جاتا ہے ہمیں تیرے پلٹ جانے کا غم

○
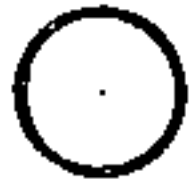
سب سے چاہت کا سلسلہ رکھنا
پھر بھی تھوڑا سا فاصلہ رکھنا

کتنا مشکل ہے زخم کھا کر بھی
دل میں جینے کا حوصلہ رکھنا

سہتے رہنا ستم بھی کانٹوں کے
اور چہرہ بھی پھول سا رکھنا

لذت درد بانٹتے ہیں ہم
ہم فقیروں سے رابطہ رکھنا

میں اُجالوں میں ڈھل کے آؤں گا
تو دریچہ سا کھلا رکھنا

ایسے لگتے ہو اور بھی پیارے
خود کو یونہی ذرا خفا رکھنا

اب تو سانسیں بھی سونپ دیں تجھ کو
اب نہ ہم سے کوئی گلہ رکھنا

عقل راہوں میں رول دیتی ہے
عشق کو اپنا رہنما رکھنا

اس کی خوشبو ہے زندگی انور
درد کا گلستاں ہرا رکھنا

○
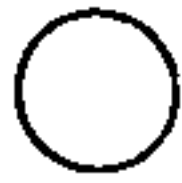
تو ہجومِ کرب میں تھا مگر تجھے حوصلہ بھی نہ دے سکا،
میرے پاس تھی جو ترے لیے، تجھے وہ وفا بھی نہ دے سکا

میرے پاس بھی تو اَلم ہی تھے، غمِ زندگی کے ستم ہی تھے
میں تمہیں تمہاری محبتوں کا کوئی صِلہ بھی نہ دے سکا

میرے پاؤں بھی تھے بندھے ہوئے، میری آنکھ میں بھی غبار تھا
تجھے منزلوں کا سُراغ کیا، میں تو راستہ بھی نہ دے سکا

اے مسافرِ شبِ زندگی! یہ تو بتا کہ کیسے کٹا سفر
مجھے معاف کر ترے ہاتھ میں، میں کوئی دِیا بھی نہ دے سکا

تیری چُور چُور وہ خواہشیں، جو تھکن سے ٹوٹ کے گر پڑیں
اُنہیں کہکشائیں تو کیا رہیں، میں تو بوریا بھی نہ دے سکا

میری بے بسی کی ہواؤں نے، میرا لفظ لفظ بُجھا دیا
میرے پاس سے تو گزر گیا، میں تجھے صدا بھی نہ دے سکا

تو اُلجھ رہا تھا جو لہر سے تو میں تجھ سے دُور بھنور میں تھا
تیرے ڈُوبتے ہُوئے خواب کو میں جو آسرا بھی نہ دے سکا

کڑے فاصلوں کی صلیب تھی، میرے اشک سے تیرے عفو تک
تجھے ہاتھ جوڑ کے پیار کا، کبھی واسطہ بھی نہ دے سکا

مجھے رتجگوں میں پرو گیا، تو فراق اوڑھ کے سو گیا
میں تجھے درازیٔ عُمر کی، میری جاں! دُعا بھی نہ دے سکا

آنسو بولتے ہیں

صدا کھو جائے غم کے جنگلوں میں
تو دُکھ اپنے دریچے کھولتے ہیں
بیاں آواز کا محتاج کب ہے
زباں چپ ہو تو آنسو بولتے ہیں

○

چہرۂ حالات کا بدلا ہوا تیور ہوں میں
درد کی آنکھوں کا اک چھلکا ہوا ساغر ہوں میں

رہگذر کی گرد میں لپٹا ہوا میرا نصیب
کیا کسی کو دوش دوں کہ راہ کا پتھر ہوں میں

اشک ہیں خوابوں کے قبرستان کے جلتے دیئے
زندگی ہے قبر میں، خود قبر سے باہر ہوں میں

جو کبھی رہتے تھے میری دسترس میں رات دن
آج اُن حالات کے پاؤں کی اک ٹھوکر ہوں میں

اپنے ہاتھوں سے بجھائے ہیں نے اپنے سب چراغ
گڑ گیا جو اپنے ہی سینے میں وہ خنجر ہوں میں

شامِ غم کو ضد ہے میرے ساتھ چلنے کی مگر
کیا خبر اُس کو کہ خود اِس شہر میں بے گھر ہوں میں

کیوں یہاں مہکے مری خوشبو سے کوئی انجمن
بوئے گُل ہوں میں نہ کوئی مُشک اور عنبر ہوں میں

کہہ رہی ہیں الوداع بجھتی ہوئی آنکھیں مری
ڈوبتی جاتی ہیں سانسیں، بس کوئی دم بھر ہوں میں

لے گیا انور سب کچھ وقت کا سیلِ رواں
آرزو کے گاؤں کا اُجڑا ہوا منظر ہوں میں

○

اِک نورِ شب کو چار طرف پھیلتا رہا
تاروں کی اوٹ، کوئی مجھے دیکھتا رہا

وُہ بھی تمام رات نہ سویا، نہ بات کی
مَیں بھی کسی خیال میں گُم، جاگتا رہا

نکلا نہیں تھا چاند مگر چاندنی رہی
بارش نہیں تھی پھر بھی بدن بھیگتا رہا

کچھ پَل رہا وہ میری نگاہوں کے سامنے
پھر مَیں تمام عمر اُسے سوچتا رہا

Marfat.com

سیلاب میں بھی راستے بنتے گئے مگر
اک اشک تھا جو پاؤں مرے روکتا رہا

کاٹ اب سزا ندامت مہر و وفا کی تو
اندھے نگر میں آئینے کیوں بانٹتا رہا

اُٹھتی رہی بدن سے چھناکوں کی گُونج سی
شب بھر مرے وجود میں کیا ٹوٹتا رہا

کوئی بہا کے اشک ہمیں دے گیا فریب
کوئی ہنسی دکھا کے ہمیں لُوٹتا رہا

شیشہ بنا تو آ لگے پتھر کئی مجھے
پتھر ہوا تو راہ کے دُکھ جھیلتا رہا

اوڑھے غبارِ عمر بھر سانسوں کے شہر میں
اک شخص زندگی کا پتہ پُوچھتا رہا

جس نے مرے لہو میں اُتاری تھی روشنی
سپنا وہی تو خوں مرا چاٹتا رہا

رُلتے رہے جو حق کو یہاں مانگتے رہے
اچھّا رہا جو بڑھ کے اسے چھینتا رہا

اُس نے کیا جو کام وہ میں نے نہیں کیا
یوں بے ادب سے بھی میں ادب سیکھتا رہا

جسموں کے قتل ہونے سے مرتی نہیں صدا
نیزے پہ بھی حسینؑ کا سر بولتا رہا

گاڑیں جہاں بھی ظلم نے انوار سولیاں
جذبوں کا آفتاب وہیں پھوٹتا رہا

○

نہ جانے گا زمانہ دُکھ دلوں کے
دریچے بند کر لو آنسوؤں کے

صداؤں کو ترس جاتے ہیں دریچے
گزر جاتے ہیں موسم آہٹوں کے

بکھیرو راستوں میں مسکراہٹ
گھروں میں چھوڑ آؤ غم گھروں کے

صلیبیں توڑ دو سب فاصلوں کی
گرا دو بُت دلوں سے نفرتوں کے

دریدہ پیرہن ہُوں مَیں تو کیا ہے ؛
گریباں چاک ہیں بخیہ گروں کے

مری آنکھوں کو پس منظر دکھاؤ
نہ پھینکو جال مجھ پہ منظروں کے

گلے ملتی ہے یُوں ہنس ہنس کے دُنیا
کھلے ہوں مُونہہ جیسے خنجروں کے

بٹے ہیں خواب یُوں قریہ بہ قریہ
عذاب اُترے ہوں جیسے ریجگوں کے

بنامِ دین دوکانیں سجی ہیں
ہوئے مذہب پہ قبضے تاجروں کے

گرے لاشے وہیں کردار کے بھی
جہاں میلے سجے قد آوروں کے

نہیں پلتے زمیں کی تہہ میں سارے
ٹھکانے اور بھی ہیں زلزلوں کے

اُچک لیں ریت کی آندھی نے مجھ سے
گہر میں نے بُنے جن سیپیوں کے

تصور کا موت کا آتا ہے ملنے
دکھا جاتا ہے منظر بُلبلوں کے

کفن پہنے گا سورج جب شفق کا
سُنے گی شام نوحے جگنوؤں کے

جلیں گی جاں کی دیواریں یہ کب تک
بدن دہکیں گے کب تک خواہشوں کے

خزاں کے کب یہاں سمٹیں گے سائے
دریچے کب کھلیں گے خوشبوؤں کے

امیرِ شہر کی شمعوں کی خاطر
دِیئے بجھتے رہیں گے مفلسوں کے

تمہیں عادت تھی سپنے دیکھنے کی
چُنو پلکوں سے ڈھیر اَب کرچیوں کے

پلٹ آئیں، ضروری تو نہیں ہے
کھُلے ہیں بادباں جن کشتیوں کے

بکھر جائیں تو شب، سمٹیں تو دن ہو
عجب ہیں سلسلے اُن گیسوؤں کے

الٰہی ؛ خیر ہو ایسے دِیئوں کی ،
جلے ہیں جو مقابل آندھیوں کے

ہَوا مایوس واپس جا رہی ہے
سجے تھے پھُول گھر میں کاغذوں کے

Marfat.com

صلیبیں ظلم کی اُکھڑیں گی کب تک
بنیں گے پھول کب سنگ راستوں کے

لہو میں کب تلک ڈوبیں گے سہرے
سہاگ اُجڑیں گے کب تک دلہنوں کے

سسکتے آنگنوں میں کب اے مولا!
جلوس اُتریں گے بھیگی ساعتوں کے

یہ شب کٹنے سے پہلے ہی رگوں میں
اُتر جائیں نہ خنجر ظلمتوں کے

ابھی منزل کہاں اے دل! چلا چل
ابھی سہنے ہیں صدمے پتھروں کے

کریں انوار! کیا ان پر بھروسہ
بدل جاتے ہیں تیور موسموں کے

Marfat.com

چاہت کے بے داغ اُجالے اَچھّے لگتے ہیں
ساجن! تیرے خواب جزیرے اُچھّے لگتے ہیں

یادیں تیری اشکوں کو یُوں پیار سے تکتی ہیں
جیسے بہنوں کو ماں جائے اچھّے لگتے ہیں

پچھلی شب کے بھیگے لمحوں کے سنّاٹوں میں
کھُلنے والے درد دریچے اچھّے لگتے ہیں

اپنے جگنو بھول کے میرے گھر آجاتی ہے
شب کو میرے اشک ستارے اچھّے لگتے ہیں

جب سے اپنوں کے احوال کھلے ہیں آنکھوں پہ
تب سے دل کو لوگ پرائے اچھّے لگتے ہیں

کوچہ کوچہ کیسے کیسے ماتم اترے ہیں
شہروں سے اب تو ویرانے اچھّے لگتے ہیں

پتھّر ہوں یا ظلمت پھر بھی ایک مسافر کو
اپنے گھر تک جاتے رستے اچھّے لگتے ہیں

سرد رگوں میں ہلکی ہلکی آنچ تو رہنے دو
جیون کے کچھ خواب ادھورے اچھّے لگتے ہیں

لوگ مسلسل خوشیوں سے اکتا بھی جاتے ہیں
گاہے گاہے کے بچھوڑے اچھّے لگتے ہیں

دُنیا کی نظروں میں چاہے بد ہوں پھر بھی تو
ماں کو اپنے راج دُلارے اچھّے لگتے ہیں

کون مرے اشکوں کے ماتھے پر لکھ دیتا ہے
ایسی عمروں والے ہنستے اچھّے لگتے ہیں

بکھرے ہوں گے ٹوٹ کے سپنے اُس کے بھی جس کو
پتھّر سے ٹکراتے شیشے اچھّے لگتے ہیں!

چھُو لیں جو انورؔ! مرے احساس کی رفعت کو
مجھ کو ایسے لوگ اچھوتے اچھّے لگتے ہیں

سنّاٹا

خواب کی گلیوں میں سنّاٹا سا کیسا ہو گیا
خون میں اپنے ہی تر شہرِ تمنّا ہو گیا
لاکھ تارے ٹوٹنے سے بھی بجھی کب روشنی
ایک دل ٹوٹا تو جیون میں اندھیرا ہو گیا

اس سے کہنا ذرا

اس کی خوشبو میں
ڈوبی ہوئی اے ہوا
آ مرے پاس آ
خود کو دامن سے تیرے میں یوں باندھ لوں
پھر نہ ہوں ہم جدا
ساتھ تیرے سدا
میں بھی اڑتا پھروں
اور گاتا پھروں
میں بھی نغمات اس کی عنایات کے
ان کمالات کے، ان حکایات کے
اس کی آنکھوں سے پاؤں
جلا ہر گھڑی
نام کی اس کے دوں میں صدا ہر گھڑی
ساتھ میرے ہوں رقصاں
فضائیں سبھی
رشکِ عنبر ہوں میری ادائیں سبھی

وجد میں ہوں
مرے ساتھ افلاک بھی
جھوم جائیے
فرشتوں کا ادراک بھی
میں اڑوں تو
مرے ساتھ اُڑ نہ سکیں
میرے درد و الم
میں چلوں تو
مرے ساتھ چل نہ سکے
سایۂ رنج و غم
میں رکوں تو
نہ پکڑے یہ پاؤں زمیں
میں جھکوں تو
نہ بوجھل ہو میری جبیں
وقت مجھ پہ نچھاور کرے کہکشاں
ہر طرف نور ہی نور کا ہو سماں
آندھیوں سے نہ مجھ کو پڑے واسطہ
بجلیاں میرا روکیں نہ پھر راستہ

میرے اندر
اُداسی نہ گونجے کبھی

میرے باہر
نہ تنہائی برسے کبھی
مَیں جہاں بھی رہُوں
میرے سر پر سَدا اُس کا سایا رہے
اَبرِ اُس کی محبّت کا چھایا رہے
اے ہَوائے خنک!
بادِ شہرِ وفا!
تُو مجھے اپنے دامن سے یُوں باندھ لے
رفعتِ آسماں
ناز مجھ پہ کرے
کہکشاں کہکشاں
ہو یہ دھرتی جہاں
میرا احساس دھیرے سے پاؤں دھرے
زندگی جب کبھی
حبس میں ڈُوب کر تلملانے لگے
تیرے ہاتھوں کے ٹھنڈے

خنک لمس کے نرم اعجاز سے
مسکرانے لگے

جب چمٹنے لگیں
دل کی دیوار سے

گہری خاموشیاں

جب سمٹنے لگیں
شب کو شہرِ سماعت کی سرگوشیاں
ایسے ماحول میں
دل کے کشکول میں
اس کے لفظوں کے سِکّے

چھنکتے رہیں

اس کی آواز کے
پھول کھِلتے رہیں

سینۂ ہجر کے چاک سِلتے رہیں

اے ہوائے خنک!
بادِ شہرِ وفا!
اس کے در سے گزر ایسے کہ ہو جو ترا

اس سے کہنا ذرا
یہ ترا بے نوا
دے رہا ہے صدا
کرب ہے آشنا
لوگ نا آشنا
کون تیرے سوا
غم کی دے گا دوا
اے مرے ساقیا!
دِلرُبا، ماہیا!
کس کو فرصت بھلا
کون آنسو بھرے
اپنے دامن میں لے
کون دے حوصلہ
سنگ زادوں کی بستی میں رہتا ہوں میں
اشک بن بن کے آنکھوں سے بہتا ہوں میں
کتنے برسوں سے
جاری ہے یہ سلسلہ
چیختا ہوں تو کوئی بھی سنتا نہیں
خواب بکھرے تو کوئی بھی چنتا نہیں

جو میرے ہر غم کو اپنے سینے لگا کے روتا، کوئی تو ہوتا
جو اپنی پلکوں پہ میرے اشکوں کے گل پروتا، کوئی تو ہوتا

کوئی تو آتا محبتوں کی بہار بن کر، قرار بن کر
میں دکھتی راتوں میں جاگتی تو نہ وہ بھی سوتا کوئی تو ہوتا

کوئی تو اک دن کہیں سے غمخواریوں کے جھرنے میں ڈھل کے آتا
سسکتی محرومیوں کے دامن سے داغ دھوتا، کوئی تو ہوتا

جو زندگی کے اجاڑ رستوں کی دوپہریں، کڑے سفر میں
شجر اگاتا، شرار چنتا، گلاب بوتا، کوئی تو ہوتا

Marfat.com

اُتار لیتا دُکھوں کے سائے، جو میرے سر سے بس اک نظر سے
وفا کی شبنم سے دشتِ احساس کو بھگوتا، کوئی تو ہوتا

جو اپنی رِم جھم سے میری شہ رگ کے بجھتے موسم کو سبز کر کے
اُداس لمحوں میں چاہتوں کی دھنک سموتا، کوئی تو ہوتا

لپیٹ کر جو ستارۂ صبحِ نو کی کرنیں مرے بدن پر
سحر کے گہرے سمندروں میں مجھے ڈبوتا، کوئی تو ہوتا

میں یونہی گر گر کے کتنے ہاتھوں سے کرچیوں میں بٹا ہوں اب تک
جو مجھ کو پاتا تو پھر کبھی عمر بھر نہ کھوتا، کوئی تو ہوتا

سمیٹ لیتا کوئی تو انوارؔ! بکھرے بکھرے سے خواب ریزے
قدم قدم کہکشاں بچھاتا، کوئی تو ہوتا، کوئی تو ہوتا

کبھی لبوں پہ بچھا لیا چپ کا جال میں نے
کبھی ہنسی میں چھپا لیا دل کا حال میں نے

مرے نقوشِ قدم رہیں گے گواہ میرے
ہوا کے رُخ پر چلی نہیں اپنی چال میں نے

نہ پوچھ کیسے دیئے بجھاتی ہوئی ہوا سے
بچا کے رکھا ہوا ہے تیرا خیال میں نے

رہا ہے احساس میرا اب کے برس بھی گھائل
کٹا ہوں پل پل میں خود کہ کاٹا ہے سال میں نے

نہ جانے کیسے ہُوا تجھے حوصلہ جفا کا
نہ جانے کیسے یہ سہہ لیا ہے ملال مَیں نے

ستم کے بارے میں مُسکرانا بھی کم نہیں ہے
کیا ہے دشمن کا یُوں بھی جینا محال مَیں نے

وُہ سب سوالوں کا بن کے ایسا جواب آیا
مٹا دیا لوحِ جاں سے پھر ہر سوال مَیں نے

اُترتے دیکھا ہے یُوں ہی انوارؔ زندگی بھر
رفاقتوں پر جُدائیوں کا وَبال مَیں نے

تصویر

تیری تصویر کو دیکھوں تو خیال آتا ہے
تو ہے یا نور کا سیلاب ہے ٹھہرا ٹھہرا
میری آنکھوں کے دریچوں میں یہ اُجلا اُجلا
تیرا چہرہ ہے کہ مہتاب ہے ٹھہرا ٹھہرا

تیری آنکھیں ہیں کہ شب تاب کے سنّاٹے میں
صفحۂ دل پہ دھنک اوڑھ کے اتری غزلیں
یا کسی جھیل میں کھِلتے ہوئے پاکیزہ کنول
جن پہ سجدوں کے لیے چاند کی کرنیں مچلیں

تیری پلکوں کے افق پر یہ تری پیشانی
صُبحدم جیسے کہ سُورج کا کنارا نکلے
تیرے عارض کے گلابوں پہ رُکے کچھ پل کو
اور پھر دُور تلک دُھوپ سنہری چمکے

اِک تسلسل سے مری سمت یہ تکنا تیرا
جیسے مِل جائیں کڑی دھوپ میں گہرے سائے
چلتے چلتے ہُوئے خم کھاتی بھنوئیں یہ تیری
زندگی جیسے حسیں موڑ کوئی مُڑ جائے

تیرے ماتھے پہ کسی سوچ کی ہلکی سی لکیر
کہکشاؤں کی گزرگاہ نظر آتی ہے
جب بھی دھندلانے لگے میرے خیالوں کا سفر
روشنی سی مرے احساس پہ برساتی ہے

یہ ترے بال یہ بالوں میں چمکتی لہریں
جس طرح رات کی گلیوں میں دمکتے جگنو!
یا کسی شہر کو جنگل سے نکلتا رستہ
یا گھنی سیاہ سی پلکوں پہ خوشی کے آنسو

Marfat.com

جھلملاتے ہوئے رُخسار پہ تیرے جیسے
کارواں صحنِ حرم میں ہوں رُکے صبحوں کے
یا ستاروں میں گھرے وصل کے خوابوں کی طرح
آبگینے شہرِ شفق میں ہوں سجے کرنوں کے

تیرے لب ہیں کہ گلابوں سے لکھے دو مصرعے
جن میں رقصاں ہے تبسّم کسی خوشبو کی طرح
ڈھل کے نغمات میں خاموش تکلّم اِن کا
حجلۂ جاں میں اُتر جاتا ہے جادُو کی طرح

جی میں آتا ہے کہوں تجھ سے کہ بولو جاناں
یہ کرشمہ بھی مرا درد دکھا دے شاید
ایک آواز یہ تو سات سُروں کا دریا
میرے صحرائے سماعت میں بہا دے شاید

لب ہلاتی نہیں تصویر کوئی بھی لیکن
رنگ تصویر کے خاموش نہیں رہ سکتے
کتنے مفہوم ہوا کرتے ہیں ان میں رقصاں
یہ وہ کہتے ہیں جو الفاظ نہیں کہہ سکتے

یوں اُترتا ہے ترا عکس نظر میں جیسے
روح کے دشت میں چاہت کا غزال آتا ہے
کیا تجھے پیش کروں، پھول، غزل، یا آنسو!
تیری تصویر کو دیکھوں تو خیال آتا ہے

❀❀❀

○

یاد کی آبشار سنّاٹے۔!
درد کے راز دار سنّاٹے

آئے خوابوں کی پالکی لے کر
لے گئے اُس دیار سنّاٹے

سب کی سوچوں میں شور برپا ہے
سب کی رُوحوں کے پار سنّاٹے

زندگی رُخ بدل گئی کتنے
ہیں مگر برقرار سنّاٹے

ساتھ رہتے ہیں ہر قدم میرے
یہ مرے سوگوار سنّاٹے

Marfat.com

پاؤں میں بج رہی ہیں زنجیریں
اور سر پہ سوار سناٹے

ایک طوفان کی علامت ہیں
بحر کے بے کنار سناٹے

تر ہے شبنم سے صبح کا دامن
شب کو تھے اشکبار سناٹے

کہہ رہے ہیں کسی کی آہٹ کا
آج بھی انتظار سناٹے

بول تصویرِ یار کچھ تو بول
کچھ تو لب سے اُتار سناٹے

اب کے اُجڑا ہر شجر چپ ہے
لے کے آئی بہار سناٹے

اے کاش!

جیون کے سمندر میں
کیوں اِتنا تلاطم ہے
جو لہر اُبھرتی ہے
کیوں حشر بداماں ہے
تھمتی ہی نہیں موجیں
ٹلتے ہی نہیں طوفاں
کیوں سطح پہ پانی کی
رُکتے نہیں سناٹے
کیوں دُور کنارے سے
اُمید سسکتی ہے
کیوں اَنت سمندر میں

Marfat.com

گُم گشتہ جزیروں کے
آثار نہیں ملتے
کس کرب میں روتی ہے
ساحل کی ہوا شب بھر
کیوں ناؤ ڈبونے کو
طوفان اُبھرتے ہیں
گھر جائیں بھنور میں جو
جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

جیون کے سمندر میں
اے کاش! کبھی کوئی
ایسا بھی سماں آئے
جو خواب بھٹکتا ہے
ہر لہر کے ہاتھوں میں
ساحل کا پتا پائے
گرداب بھی اُبھرے تو
گم گشتہ جزیروں کے
ملنے کی خبر لائے

Marfat.com

جیون کی کہانی میں
ہر موڑ پہ وحشت کا
کیوں رقص نہیں تھمتا
کیوں اشک نہیں رُکتے
کیوں چاک نہیں سِلتا
کیوں روگ نہیں ہرتے
کیوں شام اُجڑتی ہے
کیوں صُبح دہکتی ہے
کیوں زخم نہیں بھرتے
کیوں درد نہیں مِٹتا
کیوں بات نہیں بنتی
کیوں جسم سُلگتا ہے
کیوں رُوح تڑپتی ہے
کیوں پھُول نہیں کھلتے
چاہت سے جو آنکھوں میں
یاں خواب پروتے ہیں
وہ درد کے مارے پھر
کیوں چھُپ چھُپ روتے ہیں

جیون کی کہانی میں
اے کاش ، کبھی کوئی
اِک موڑ ہو ایسا بھی
ہر زخم جہاں اپنا
ڈھل جائے گلابوں میں
اور اُن پہ محبّت کی
شبنم سی بکھر جائے
ہر شام کے آنگن میں
ہو رقص کناں خوشبو
ہر صبح کے دامن میں
پیغام مسرّت ہو
لہرائے نہ آنکھوں میں
آلام کا سایہ بھی

جیون کی کہانی میں
اے کاش کہیں کوئی
اِک موڑ ہو ایسا بھی

خزاں

میں وہ خزاں ہوں
کہ نارسائی کے دشت میں
جس نے چلتے چلتے
تھکن سے بے حال ہو کے جس بھی
شجر کے سائے میں
دم لیا تو
اُسی کے پتے بکھر گئے ہیں

Marfat.com

تحفظ

چل مرے ساتھ اے سایۂ شامِ غم؟
رہ گیا ہے جو خونِ جگر چاٹ لے
مار دے گی تجھے شہر کی روشنی
آ مرے گھر کے آنگن میں شب کاٹ لے

ہائیکوز

دُور سے اِک صدا سی آتی ہے
اوڑھ کے تن بدن پہ تنہائی
کون روتا ہے شب کے جنگل میں

کیا عجب زندگی کے موسم تھے
جب سے تُو زندگی سے رُوٹھا ہے
زندگی اِس طرف نہیں آئی

وقت کا کھیل بھی عجب ہے جو
کچھ غموں کو سمیٹ کے ہم پہ
کچھ نئے دُکھ اُتار دیتا ہے

شہر کی بھیڑ میں کسے فرصت
کون دیکھے یہ بے بسی میری
ہر کوئی اپنی ذات میں گُم ہے

یُوں بھی دل کا قرار پاتے ہیں
آنسوؤں کے چراغ ہم اکثر
خُود بجھاتے ہیں خُود جلاتے ہیں

❁

یہ بہت بے مثال چیزیں ہیں
رُوح و لب تیرے نام کے مسکن
اور آنکھیں تری کنیزیں ہیں

❁

ہر طرف زندگی کا میلا ہے
اتنے چہروں کے بیچ بھی یارب!
دل مرا کس قدر اکیلا ہے

❁

شہر کی خاک چھان کر شب کو
لَوٹتا ہُوں تو گھر کی تنہائی
مجھ سے بے ساختہ لپٹتی ہے

❁

آرزوؤں کے سرد موسم میں
برف ہو جائے جسم بھی جب تو
کیوں یہ پرچھائیاں سلگتی ہیں

❀

خواب کا انتظار تھا برسوں
خواب آیا تو میری آنکھوں سے
لے اُڑا نیند زندگی بھر کی

❀

کہہ رہے ہیں بزرگ گاؤں کے
آج ہیں جس مقام پہ قبریں
کل وہاں قہقہے برستے تھے

❀

خواب بکھرے ہیں جا بجا میرے
آج اِن زخم ہاتھوں سے
کس طرح کرچیاں سمیٹوں میں

❀

کتنا شیریں ہے یہ ترا لہجہ
پر تری نرم نرم باتوں سے
طنز کا زہر کیوں ٹپکتا ہے

❁

زندگی کا یہ کونسا رُخ ہے
مِل بھی جائے خوشی بھی تو سر سے
غم کی پرچھائیاں نہیں جائیں

❁

ہجر میں زندگی گزاری ہے
پُوچھتا پھر رہا ہُوں ساحل سے
اُس نے کشتی کہاں اُتاری ہے

❁

جب کسی چشم کو نہ نم دیکھا
مَیں نے اس کے کھُلے دریچے سے
دل میں جھانکا تو غم ہی غم دیکھا

❁

○

کاٹوں اُلجھے اُلجھے جال جُدائی میں
بیت گئے ہیں کتنے سال جُدائی میں

آنکھوں میں ہر شام اُتر کے کہتی ہے
اشکوں کا اِک جام اچھال جُدائی میں

تارا تارا دیکھے میری گھبراہٹ
رستہ رستہ پوچھے حال جُدائی میں

اُس کے ملنے کا سندیسہ لے کر آ
موسم! اب کے یوں نہ ٹال جُدائی میں

پچھلی شب کچھ ٹیسیں ملنے آتی ہیں
کہتی ہیں یوں روگ نہ پال جدائی میں

چہرے کا ہے رنگ خزاں کے پتّے سا
اُترا کیسا زرد ملال جدائی میں

چمکا ایک ہی نام دُعا کے ماتھے پہ
کیا کرتا میں اور سوال جدائی میں

رگ رگ میں اِک چاند کی خواہش جاگی تھی
چاندی کیوں نہ ہوتے بال جدائی میں

لمحہ لمحہ دل کو دھڑکا رہتا ہے
کٹ جائے گا یہ بھی سال جدائی میں

جنتر منتر والو! تم ہی بتلاؤ
کیا کہتی ہے اب کے فال جدائی میں

Marfat.com

دیکھا عید کا چاند تو میرے سینے میں
اُترا بن کے تیر ہلال جُدائی میں

کہتے ہیں کہ عرش بھی ہل ہل جاتا تھا
دیتا تھا جب ہُوک بلالؓ جُدائی میں

لِکھ کے نام تمہارا اُس پہ ڈال دیا
مَیں نے پھُولوں کا اِک تھال جدائی میں

منظر منظر تیرا جلوہ دیکھا ہے
چمکا تیرا اور جمال جُدائی میں

اپنے سینے آپ لگا اور خود ہی سے
پُوچھا مَیں نے اپنا حال جدائی میں

اُبھرے جیسے آہٹ تیرے قدموں کی
ٹِک ٹِک بجتا ہے گھڑیال جدائی میں

رکھ دیتا ہے ہاتھ تڑپتے دل پر تو
دیکھا تیرا روز کمال جدائی میں

جاگتی ہیں انوارؔ مرے سنگ آنکھیں بھی
سپنوں کی اک اوڑھ کے شال جدائی میں

○

اس نے جلا کے خواب کی دہلیز پر دیا
پھر اس دیے سے خواب مرا راکھ کر دیا

اک شام نے نظر میں اُجالے سمو دیئے
اک صُبح نے نظر کو فریبِ سحر دیا

کاٹی ہیں میرے ہاتھ کی ظالم نے اُنگلیاں
کیسے جلائے شہر میں میرا ہُنر، دیا

لقمہ ڈبو کے زہر میں دے گا وُہ اب مجھے
سیلاب جس نے چھوڑ کے رہنے کو گھر دیا

برسوں کے بعد اُس کی صداؤں نے آج پھر
دامن سماعتوں کا ستاروں سے بھر دیا

جاناں! تمہارے پیار کی مہکار کے عوض
ہم نے ہر ایک سانس ترے نام کر دیا

آیا نہیں وہ اور ستارے بھی ڈھل چکے
کِس دُھن میں جل رہا ہے مرا بے خبر دِیا

آخر وہ نہ آئے، مگر اُس کے نام کا
روشن سدا رہے گا سرِ رہگذر دِیا

Marfat.com

○
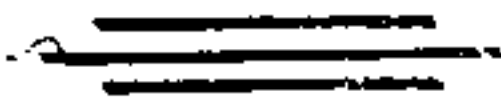
چاہتوں کے دائرے سے جب نکل جاتے ہیں لوگ
راستوں کے ساتھ چہرے بھی بدل جاتے ہیں لوگ

جا رہے ہو تم اگر سنگلاخ رستے چھوڑ کر
سوچ لینا، سنگِ مرمر پہ پھسل جاتے ہیں لوگ

رقص کرتے ہیں لہو کی آبشاروں میں یہاں
دشمنی میں کس قدر آگے نکل جاتے ہیں لوگ

موج میں آئیں تو کانٹے بھی سجا لیں جسم پر
اور جی چاہے تو کلیاں بھی مسل جاتے ہیں لوگ

میں جو روتا تھا تو ہنستے تھے مرے رونے پہ سب
مسکراتا ہوں اگر میں اب تو جل جاتے ہیں لوگ

زہر، ظلمت، آگ، پتھر، اشک، سناٹے، لہو
زندگی کے جبر سے کیا کیا نگل جاتے ہیں لوگ

مجھ کو بہلایا ہے تیری یاد نے یوں جس طرح
نیند کے آنگن میں خوابوں سے بہل جاتے ہیں لوگ

حسرتوں سے دیکھتے ہیں ڈوبتے سورج کو جب
غم کی گہری شام کے سائے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ

سکوت

کہنا چاہوں بھی کچھ تو ہونٹوں سے
دل کی ہر بات لوٹ جاتی ہے
جیسے اک بد نصیب آنگن تک
آ کے بارات لوٹ جاتی ہے

○

کیا کہوں کیا کیا ستم اِک جاں پہ کر جاتی ہے رات
جاگ اُٹھتے ہیں ہرے سب غم تو مر جاتی ہے رات

میری آنکھوں سے ستاروں کا سمندر چھین کر
چند قطرے اوس کے پلکوں پہ دھر جاتی ہے رات

کاٹتی ہے وقت کے جنگل میں وحشت کا سفر
چیخ اُٹھتی ہے جو تنہائی تو مر جاتی ہے رات

رفتہ رفتہ ڈوب جاتا ہے جو سورج آس کا
دھیرے دھیرے دل کے آنگن میں اُتر جاتی ہے رات

روشنی میں بھی نظر آتی نہیں کیوں منزلیں
کیوں نہیں جاتے اندھیرے بھی اگر جاتی ہے رات

دن نکلتا ہے تو در آتی ہے آنکھوں میں جلن
چھوڑ کر گلنار خوابوں کے شرر جاتی ہے رات

منعکس ہوتا ہے چہرے سے اُجالا رُوح کا
رُوح کالی ہو تو چہرے پر بکھر جاتی ہے رات

چاند سورج کس کی دُھن میں رہتے ہیں محوِ سفر
کس نگر جاتا ہے دن اور کس کے گھر جاتی ہے رات

کروٹیں لے لے کے تھک جاتی ہے عقلِ نارسا
عشق کے بس ایک سجدے میں گزر جاتی ہے رات

بٹ رہی ہیں روشنی کے نام پر تاریکیاں
جس طرف جاتے ہیں یہ رہبر، اُدھر جاتی ہے رات

پھیل جاتی ہے دھنک انوارؔ دل سے تا اُفق
یاد کے خاکے میں کتنے رنگ بھر جاتی ہے رات

اُداسیوں میں سسک سسک کے بھرے جہاں سے گزر چکا ہے
بہار آئی تو اُس سے کہنا، وہ منتظر تیرا مر چکا ہے

رگوں میں بہتے لہو میں شامل تھا خوف جس کی تباہیوں کا
حدودِ شہرِ بدن میں آخر، وہ زلزلہ پاؤں دھر چکا ہے

کسی کے چہرے کی گرد دھونے کی آرزو اور جستجو میں
غبارِ غم بن کے اس کی راہوں میں خود بھی کوئی بکھر چکا ہے

بچانے آئے ہو چارہ گر بن کے آج جس کے اثر سے مجھ کو
وہ زہر تو نخلِ جاں کی گہری جڑوں میں کب کا اُتر چکا ہے

بعید کیا ہے؟ کہ ایک دن جا ملے وُہ اپنے ہی دُشمنوں سے
جو جھوٹی ہمدردیوں میں لپٹے سیاہ چہروں سے ڈر چکا ہے

وہی اُداسی، وہی سفر ہے، وہی درندے، وہی خطر ہے
وُہ جس میں اُگنے تھے چاند تارے وُہ شہر جنگل سے بھر چکا ہے

بدل بدل کے نئے لبادے نہ سامنے آ، اے خوابِ رفتہ!
تو اس سے پہلے بھی زندگی کو بہت پریشان کر چکا ہے

حقیقتیں ہو گئی ہیں انوارؔ مطلعِ حسنِ ظن سے ظاہر
کٹی ہے خوش فہمیوں کی شب تو ہر ایک منظر نکھر چکا ہے
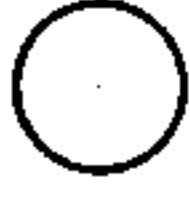
گُل سرِ شاخِ جاں کِھلا کوئی
خوشبوؤں سے نگر بسا کوئی

بات دُنیا سے بڑھ گئی آگے
ہو گیا خود سے بھی خفا کوئی

شام لے آئی ساتھ ویرانے
اجنبی ہے نہ آشنا کوئی

اب یہاں زندگی نہیں رہتی
دے نہ در پر مرے صدا کوئی

سانس چلتے رہے دھواں بن کر
خوں میں جلتی رہی چِتا کوئی

تُو اگر دوست ہے تو آخر کیوں
مجھ سے کرتا نہیں گِلہ کوئی

موت آئے نہ موت سے پہلے
ہو نہ اپنوں سے یوں جُدا کوئی

یاد آیا ترا بچھڑ جانا
بُجھتے دیکھا اگر دِیا کوئی

اُس کے اشکوں کا ساتھ دینے کو
رو دیئے ہم تو ہنس پڑا کوئی

آپ کو دیکھ دیکھ جیتے ہیں
لب پہ لیکن نہیں صدا کوئی

یُوں بھی اختر رائیگاں تھے ہم
کیوں ہمیں آکے پُوچھتا کوئی

دو لمحے

تُم تکتے ہو تو رنگوں کے
اِک جھرنے میں بہہ جاتا ہُوں
پر جب تُم آنکھ ہٹاتے ہو
مَیں تنہا سا رہ جاتا ہُوں

○

اُس گلی سے گزر کے دیکھ لیا
کہکشاں میں اُتر کے دیکھ لیا

رنگ و بُو میں وہ منفرد ٹھہرا
ہر چمن نے سنور کے دیکھ لیا

صبر آتا نہیں ہمیں تجھ بن
دل پہ پتھّر بھی دھر کے دیکھ لیا

عکس پھیلا ہے اور بھی میرا
آئینوں نے بکھر کے دیکھ لیا

Marfat.com

کھو دیا ہم نے زندگی! تجھ کو
موت سے پہلے مر کے دیکھ لیا

اور کس کس کا خوف کھاؤ گے
اب تو خود سے بھی ڈر کے دیکھ لیا

زخم تو بھی نہ سی سکا میرے
جا ترا دم بھی بھر کے دیکھ لیا

شورِ انوار! کیوں نہیں تھمتا
خود کو تنہا بھی کر کے دیکھ لیا

○

اُس نگر حوصلوں پہ کیا گُزری
کچھ کہو، چاہتوں پہ کیا گزری

ہم تو تھے غرقِ آب کیا جانیں
دُور ان ساحلوں پہ کیا گزری

دم بخود کیوں ہے چُپ کے جنگل میں
دَرد کی وحشتوں پہ کیا گزری

کچھ نہ پُوچھو کہ شب کی خلوت میں
ہم سے تیرہ شبوں پہ کیا گزری

Marfat.com

دشت کی بات چھوڑیئے، کہیے!
شہر کی رونقوں پہ کیا گزری

آ کے دیکھو کبھی کہ بن تیرے
غم کے مارے ہوؤں پہ کیا گزری

در مرا پوچھتا ہے مجھ سے، اُن
دستکوں، آہٹوں پہ کیا گزری

تو ہی بتلا، ہوا! کہ میرے بعد
گھر کی تنہائیوں پہ کیا گزری

زرد کیوں ہو گئے لب و رخسار
آپ کی رنگتوں پہ کیا گزری

مرنے والے تو مر گئے لیکن
سانس لیتے ہوؤں پہ کیا گزری

جن کی کھلتے ہی اُڑ گئی خوشبو
سوچنا اُن گلوں پہ کیا گزری

وصل کی رُت میں سوچنا بیکار
ہجر کے موسموں پہ کیا گزری

ہم تو تھے راہرو ہمارا کیا؟
راستو! رہبروں پہ کیا گزری

جلنے والوں کو کیا خبر انوار!
بجھنے والے دیوں پہ کیا گزری

یاد

کفن اوڑھے ہوئے
کچھ خواب
سوئے ہیں جو کب کے
رُوح کے شہرِ خموشاں میں
انہی لُوٹے ہُوئے
بکھرے ہوئے خوابوں کی برسی پہ
ہزاروں غم اُمڈتے ہیں
عجب میلہ سا لگتا ہے
جنہیں خُونِ جگر دے دے کے
مَیں نے جگمگایا تھا

جنہیں آنکھوں کے اِس گلدان میں
مَیں نے سجایا تھا
اب اُن کی یاد آنکھوں کے
دریچوں میں سجاتا ہُوں
مَیں اِس شہرِ خموشاں میں
دھنک آمیز اشکوں کے
چراغ اَب بھی جلاتا ہوں

Marfat.com

اُس وقت تُم کہاں تھے؟

اُس وقت تُم کہاں تھے
جیون تھا دوپہر جب!
ایسے میں تم ملے ہو!
جب شہرِ زندگی میں!
میری زخم زخم آنکھیں
میرے ٹوٹنے کا منظر
میری کرچیوں کا میلہ
ہر گام تک رہی ہیں
میرے سبز سبز موسم!
راہیں بدل رہے ہیں
میرے سانس بُجھ رہے ہیں
میرے خواب مر رہے ہیں
میری راکھ اُڑ رہی ہے
میری شام ڈھل رہی ہے

Marfat.com

مِلنا ہی تھا تو ملتے

جیون کی دوپہر میں

شاداب ولولوں کی !

وہ رَوِش تو دیکھ لیتے

میرے خوں میں تھی جو رقصاں

وہ تپش تو دیکھ لیتے !

ہاتھ میں تھامے ہوئے
خوشیوں کے گجرے
عید آتی ہے تو مَیں یہ سوچتا ہوں
سال بھر کے بعد آخر
وقت کا یہ اِک تبسّم
سال کے دُکھ کا مداوا تو نہیں

حسرت و یاس میں دن رات جلیں گی آنکھیں،
اَب نہ پلکوں سے کوئی خواب بُنیں گی آنکھیں

یہ تو لوگوں کا وطیرہ ہے، بُرا کیوں مانوں
مُسکرائیں گے اگر لب تو ڈسیں گی آنکھیں

ان کے ہنسنے پہ نہ جا ورنہ خبر تب ہوگی
جب صلیبوں کی طرح دل میں گڑیں گی آنکھیں

روشنی ان کی ترے دم سے ہے قائم اب تک،
تو چلا ہے تو بتا کیسے جئیں گی آنکھیں،

تجھ سے چاہوں بھی تو اب دور نہیں جا سکتا
پاؤں اٹھے گا تو زنجیر بنیں گی آنکھیں

زندہ رہنا ہے انہیں تیری کنیزیں بن کر
اب ترے بعد کسی پہ نہ اٹھیں گی آنکھیں

مدّعا سن نہ مگر اذن رسائی دے دے
تجھ کو دیکھیں گی فقط، کچھ نہ کہیں گی آنکھیں

یونہی اذواؔر یہاں سنگ بکف لوگوں میں
زخم کھائیں گی سدا، اشک پئیں گی آنکھیں

○

اپنی ہر بات میں دے دے کے حوالے میرے
اُس سے کہنا کہ نہ یوں درد اُچھالے میرے

میں نے پلکوں سے چُنے خار بھی جس کی رہ کے
اُس ستمگر نے بھی کانٹے نہ نکالے میرے

میں لہو دوں گا چراغوں کو مگر وہ آ کر
اپنے داغوں میں سجا لے گا اُجالے میرے

کچھ نہ پاؤں گا سرابوں کے سوا میں لیکن
دشت میں پھول کھلا جائیں گے چھالے میرے

کتنے پُرنور حقائق کا پتا دیتے ہیں
دیکھنے کو تو یہ الفاظ ہیں کالے میرے

بانٹ لیتے ہیں یہ اشعار مرے ہر غم کو
یہ مرے لختِ جگر، لاڈ کے پالے میرے

ٹوٹنا دیکھتی ہوگی وہ لحد سے مجھ کو
جس کی ممتا نے کھلونے بھی سنبھالے میرے

لمحہ لمحہ دلِ انوار دُعا دیتا ہے
تو سلامت رہے اے بھُولنے والے میرے!

Marfat.com

شجر سایہ دار
میں وہ شجر ہوں جو خود کڑی دھوپ کی اذیت میں جل رہا ہے
مگر جھلستی ہوئی زمیں اوڑھ کر بھی سایہ اگل رہا ہے

Marfat.com

آخر

اَٹے ہوئے ہیں جو کانٹوں سے راستے تو کیا
قدم ضرور اُٹھیں گے اَٹک اَٹک کے سہی
سَفرِ حیات کا آخر گزر ہی جائے گا
ہنسی خُوشی جو نہیں تو سِسک سِسک کے سہی

○

غم کی برسات میں زندگی کٹ گئی
یوں ہی صدمات میں زندگی کٹ گئی

اُن کا اظہار بھی کر نہ پائے کبھی
جن خیالات میں زندگی کٹ گئی

آئیں گے دن بھلے سوچتے ہی رہے
بس اِسی بات میں زندگی کٹ گئی

زخم ملتے رہے، درد پلتا رہا
ایسے حالات میں زندگی کٹ گئی

Marfat.com

ہم کو ڈستے رہے جن کے دیوار و در
اُن مکانات میں زندگی کٹ گئی

جن کی آنکھوں میں سپنے ستاروں کے تھے
اُن کی حشرات میں زندگی کٹ گئی

چاند نکلا نہ انوار پھر وصل کا
چاہِ ظلمات میں زندگی کٹ گئی

دل سمندر ہے

دل سمندر ہے
اس سمندر میں
ہر طرف سینکڑوں جزیرے ہیں
ہر جزیرے میں
ایک خیمہ ہے
اور پھر
ان تمام خیموں میں
زندگی کی
اُداس یادوں کے
دیپ سے جھلملاتے رہتے ہیں

○

کفِ وجود پہ رکھا ہوا عدم ہوں میں
ہوائے دشت ہے اور ریت پہ رقم ہوں میں

رگوں میں میری، محبت کی روشنائی بھر
کتابِ زیست کا سوکھا ہوا قلم ہوں میں

بجھے ہوئے ہیں ستارے مری تمنّا کے
اداسیوں میں گھری شامِ چشمِ نم ہوں میں

میں لٹ گیا تو بکھر جائے گا کوئی غم سے
کسی غریب کی جوڑی ہوئی رقم ہوں میں

لبوں پہ رقصِ تبسّم کو دیکھنے والو!
اُتر کے دیکھو جو مجھ میں تو غم ہی غم ہوں میں

تڑپ نہیں تو رہے گی خلیج بھی حائل
اگر ہے جذبہ صادق تو دو قدم ہوں میں

کسی نے پیار سے دی ہے مجھے صدا جب سے
خود آپ اپنی لگا ہوں میں محترم ہوں میں

اے شہرِ عہد شکن! احترام کر میرا
کسی کے سر کی اٹھائی ہوئی قسم ہوں میں

الوداع

الوداع
الوداع بے خواب آنکھو! الوداع
تم مرے سنگ
جاگتی تھیں
قطرہ قطرہ رتجگوں کے زہر کو
تم مرے سنگ
جھیلتی تھیں
لمحہ لمحہ درد کی ہر لہر کو
سو گیا میں
نیند کے شانوں پہ سر رکھ کے کبھی
تم نے میرے واسطے سپنے بُنے

Marfat.com

خواب جو تم نے بُنے
وقت نے اُن کے لیے پتھر چُنے
اور میں
مدفون خوابوں کی لحد پر دم بخود
عُمر بھر بس ہچکیاں بُنتا رہا
آرزوؤں کی شکستہ کرچیاں چُنتا رہا
ٹوٹتا تھا جب کوئی سپنا
تو رو دیتی تھیں تم
اور گر جاتا تھا جب اِک
آس کا تارا تو پھر یُوں
آنسوؤں کے کتنے تارے
میری پلکوں پہ پرو دیتی تھیں تم
جب کبھی
گُل ہو گئے
ہونٹوں پہ لفظوں کے چراغ
تم مرا احساس بن کر خود چراغاں ہو گئیں
بُجھتے لہجے کی ہتھیلی پہ فروزاں ہو گئیں
اور اب

بجھنے لگے ہیں
میرے سانسوں کے دیئے
اپنے خوابوں کی طرح خود ٹوٹنے والا ہوں میں
وقت کے ہاتھوں سے آخر
چھوٹنے والا ہوں میں
میں نے چننے تھے جو کانٹے چن لیے
تم نے بننے تھے جو سپنے بن لیے
بڑھ رہی ہے
اب مری جانب یہاں
آخری ہچکی کی ناؤ جو مجھے
زندگی کے بحر کے
اس پار لے جانے کو ہے

اے مرے
جیون کے زریں پاکنارو! شب بخیر
ساحلوں کی ریت میں مدفون سپنو! الوداع
الوداع تم کو مری بے خواب آنکھو! الوداع

نت نئے دیکھے ستم احباب کے

Marfat.com

اَب کوئی حرفِ تسلّی
کِس لیے ؛
دستکیں دیتا رہا ہُوں مَیں سَدا
اَب کسی دَر کی تجلّی
کِس لیے ؛
عمر گزری خُشک پتّے کی طرح
اَب کِسی وعدے کا گجرا
کیا کرُوں ؛
بے حِسی کی لُو نے جب جھُلسا دیا
اَب کسی دامن کا سایا
کیا کرُوں ؛

دیکھ لیں
اَپنوں کی سب عیّاریاں
پُشت پیچھے کی ہنسی اور سامنے کی یاریاں
قدر دانی چاہتوں کی دیکھ لی
دیکھ لیں جذبات کی سَب حُرمتیں
ضوفشانی اُلفتوں کی دیکھ لی
دیکھ لیں سب قربتیں سب سنگتیں

بڑھ رہے ہیں

آج کیوں بہرِ عبادت وہ قدم

جو مجھے ہر دم کچلنے کے لیے تیّار تھے

اُٹھ رہے ہیں

سامنے وہ ہاتھ کیوں بہرِ دُعا:

جن میں کل میرے گریباں کے وہ اُلجھے تار تھے

دے رہے ہیں یوں سہری

اُکھڑی ہُوئی سانسوں کو اب وہ حوصلہ

جیسے مجھ کو زندگی کی بھیک دینے آئے ہوں

مکر میں

ڈُوبے ہُوئے لفظو تمہیں میرا سلام

مصلحت کی چال سے لبریز لہجہ: الوَداع

الوَداع اے کھوکھلے جھُوٹے دلاسو: الوَداع

رہبروں کی

بھیڑ میرے چار جانب تھی مگر

پھر بھی مجھ کو منزلوں کی روشنی نہ مِل سکی

ہم سفر

وحشت رہی ہر موڑ پہ
ہر قدم اُڑتی رہی گردِ فغاں
کھو گیا رہ میں مرے جذبوں کا بہتا کارواں
جن کے نقشِ پا پہ مَیں
برسوں رہا ہُوں گلفشاں
اُن کی جانب سے مجھے پتھّر ملے
مجھ کو چاہت کے عوض
بدلے ہُوئے تیور ملے
زہر کے ساغر ملے اور طنز کے نشتر ملے
جب چراغِ منزلِ جاں
جِھلملایا بھی کبھی
نوچ لی یوں آنکھ سے میری انہوں نے ہر کرن
میری پلکیں
تہہ بہ تہہ تاریکیوں سے بھر گئیں
پھول کو چھُونے سے پہلے
تِتلیاں ہی مر گئیں
تن بدن پہ اوڑھ کر
ملبوس جلتی دھُوپ کا

بے بسی سے میری خود رستے لپٹ کر رو پڑے
دیکھ کر ہنستے رہے انسان، پتھر رو پڑے
اس غبارِ راہ میں گم
میری منزل کے چراغو!
کہہ رہا ہے اک مسافر
اب خدا حافظ تمہیں
الوداع سنگلاخ رستوں کی تھکن
الوداع اے رہبرو! اے رہنماؤ الوداع

اک دیا تنہا جلا ہے
رونقوں کے شہر میں
در بدر کوئی پھرا ہے
دوستوں کے شہر میں
یوں ہی ڈر ڈر کے جیا ہے
تہمتوں کے شہر میں
تشنہ لب جیون رہا ہے
ساقیوں کے شہر میں

صرف سنّاٹا پیا ہے
دستکوں کے شہر میں
دھوپ کا دکھ ہی ملا ہے
برگدوں کے شہر میں

شہر، جس میں
ہر طرف
ہر سمت، ہر ہر موڑ پہ
زندگانی کے جھمیلے تھے بہت
ان جھمیلوں میں بھی تا حدِّ نظر
کرب کے، تنہائیوں کے، غم کے میلے تھے بہت
لاکھ چٹکیں
خوشنما لفظوں کی کلیاں بھی مگر
ساتھ اُن کے
دل کی ویراں دھڑکنیں چہکیں
ضروری تو نہیں

لاکھ مہکیں
خُلدِ لب میں

مُسکراہٹ کے کنوّل
اور دریچے رُوح کے مہکیں
ضرُوری تو نہیں

عمُر بھر
محرُومیوں کا زہر چاٹا ہوا گر
بھُول جاتی ہے زباں خُوشیوں کے سارے ذائقے
لمحہ لمحہ جب
اُداسی کی رِدا بُنتا رہے
کون پھر چاکِ گریباں کو سِیے
کیسے سِیئے؟

کیسے سِیئے؟ کیسے جیئے؟
زندگی تم کو مُبارک
جینے والو! السّلام
الوداع اے میری جلتی بجھتی تنہائی کی شام!
رونقوں کے شہر میں اے غم کے میلو! الوداع
الوداع اے آنسُوؤں کے بہتے ریلو! الوداع

نوٹ

محترم قارئین ۔ آئندہ میری شاعری کی تمام نئی کتب
اور سابقہ کتب کے نئے ایڈیشن میرے انوار فریدی ہی
کے ادبی نام سے شائع ہوں گے اصل نام انوار المصطفیٰ ہمدمی
صرف میرے مخصوص معاملات میں استعمال ہو گا ۔
ادبی نام مستقل انوار فریدی ہو گا ۔

انوار فریدی

صدا کھو جائے غم کے جنگلوں میں
تو دُکھ اپنے دریچے کھولتے ہیں
بیاں آواز کا محتاج کب ہے
زباں چُپ ہو تو آنسو بولتے ہیں

Marfat.com

صدا کھو جائے غم کے جنگلوں میں
تو دُکھ اپنے دریچے کھولتے ہیں
بیاں آواز کا محتاج کب ہے
زباں چُپ ہو تو آنسو بولتے ہیں